دہلی کا

ایک یادگار مشاعرہ

یا

دہلی کی آخری شمع

از

مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی،

تنقید و تبصرہ

احسان الحق اختر

ادبی لائبریری لاہور؛

دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ

یا

دہلی کی آخری شمع

از

مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی

تنقید و تبصرہ

احسان الحق اختر

ادبی لائبریری - لاہور

پبلشر ——— ادبی لائبریری۔ لاہور
پرنٹر ——— نذیر حسین
طابع ——— پنجاب پریس لاہور

اشاعت اوّل مارچ ۱۹۶۸ء

میرزا فرحت اللہ بیگ

حالات زندگی میرزا فرحت اللہ بیگ ۱۸۸۳ء کے آخر یا ۱۸۸۴ء کے شروع میں پیدا ہوئے[1]۔ ابتدائی تعلیم اسلامی طریقے پر ہوئی۔ مرزا فرحت ترک نژاد تھے۔ آپ کا خاندان شاہ عالم کے زمانے میں ہندوستان آیا۔ فرحت کا تعلق خاندانی رشتے سے خواجہ میر درد اور مومن سے بھی تھا۔ آپ کے دو حقیقی چچا بھی شاعر تھے۔ ایک شاکر تخلص کرتے تھے دوسرے ذاکر۔ مرزا صاحب کو کم عمری میں ہی شاعری سے لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ آپ بڑے ذہین اور لائق طالب علم تھے۔ ابتدائی تعلیم کے مختلف درجوں میں ہمیشہ اوّل، دوم رہے اور وظیفہ بھی حاصل کیا۔ انٹرنس کا امتحان اس امتیاز سے پاس کیا کہ انعام میں نقرئی تمغہ ملا۔

مرزا فرحت اللہ بیگ بڑے صاف گو اور بے باک تھے اور بعض اوقات اُن کی اسی خوبی یا کمزوری کے بے محل استعمال سے ناخوشگواری یا بدمزگی بھی پیدا ہو جاتی تھی۔ ایک دفعہ فارسی کے پیریڈ میں مولوی میر شاہجہان پڑھا

---

[1] یادگار فرحت۔ مضمون۔ غلام یزدانی ص۳۵) یادگارِ فرحت کی تمہید میں یزدانی صاحب، فرحت کی تاریخ پیدائش کے بارے میں لکھتے ہیں "فرحت ذی قعد کے مہینے میں جسکو دلی کی عورتیں خالی کا مہینہ کہتی ہیں، پیدا ہوئے، ہجری سال ۱۳۰۰ تھا اور عیسوی سال اور مہینہ ستمبر ۱۸۸۳ء۔ ایک ہی کتاب کے دو مضمونوں کا یہ تضاد بڑا عجیب ہے جبکہ دونوں کا مصنف بھی ایک ہی ہے۔

رہے تھے۔ حدیقۃ البلاغت پڑھی جا رہی تھی۔ اور خود معنی الفاظ کی تشریح ہو رہی تھی۔ اس سلسلے میں فرحت صاحب نے بے دھڑک یہ شعر پڑھ دیا ؎

زبانِ آن پسر[۱] ترکی و من ترکی نمی دانم
چہ خوش بودے اگر بودے زبانش در دہانِ من

مولوی صاحب جلال میں آگئے اور کہا جب بزرگوں کے سامنے بات چیت کیا کرو۔ اور پڑھا کرو تو ان کے وقار اور آدابِ مجلس کا خیال رکھا کرو۔

کالج میں پہنچ کر مرزا فرحت کی ذہانت کے جوہر خوب نمایاں ہوئے۔ بی اے میں انہیں ایک مضمون لکھنے پر ہارکورٹ پرائز ملا۔ فرحت اللہ بیگ اداکاری میں بھی طاق تھے۔ مکالموں میں جذبات کے اتار چڑھاؤ کو عمدگی کے ساتھ نمایاں کرنے میں انہیں کمال حاصل تھا۔ پادری اینڈروز انہیں شیکسپیئر پڑھاتے تھے۔ "مرچنٹ آف وینس" نصاب میں شامل تھا۔ فرحت ہنری ففتھ کی یہ تقریر (once more into the breach) اس مؤثر طریقے سے جماعت میں سناتے کہ انگریز پادری عش عش کر اٹھتا۔ اسی ڈرامے کا شائیلوک کا کردار بھی آپ عمدگی سے کرتے تھے۔ ایک دفعہ کالج کے سالانہ جلسے میں جب یہ ڈراما ہوا تو انگریز حکام نے فرحت کی اداکاری کی دل کھول کر داد دی کہ ایک ہندوستانی لڑکا انگریز کے جذبات کو کس خوبی سے ادا کر رہا ہے۔ مرزا صاحب کی آواز بڑی سریلی تھی۔ آپ اپنے ساتھیوں کو ان کی پسند کے گیت سنا کر محفوظ کیا کرتے تھے۔ کالج کی تعلیم سے فراغت

---

[۱] یہ شعر امیر خسرو کا ہے اور اس کا پہلا مصرعہ اس طرح ہے ع
زبانِ شوخِ من ترکی و من ترکی نمی دانم
(اردو ادب میں طنز و مزاح۔ ڈاکٹر وزیر آغا)

کے بعد آپ نے اداکاری کے ذوق کی تسکین کے لئے ایک (Amateur Dramatic club) قائم کی۔ جس نے مختلف ڈرامے سٹیج کئے۔ حیدر آباد میں ملازمت اختیار کرنے کے بعد بھی آپ کا یہ شوق برقرار رہا۔ مرزا صاحب نے بی اے کا امتحان ۱۹۰۵ء میں امتیاز کے ساتھ سینٹ سٹیفنز کالج سے پاس کیا۔

مرزا فرحت بڑے اچھے تیراک اور ٹینس اور کرکٹ کے بہترین کھلاڑی تھے۔ سکول کے زمانے ہی میں ان کا شمار کرکٹ کے اچھے کھلاڑیوں میں ہوتا تھا کالج آکر تو وہ اور بھی چمکے۔ ۱۹۰۱ء میں آپ نے ہندو کالج میں داخل لیا۔ یہ کالج نیا نیا قائم ہوا تھا۔ ابتدا میں جن لوگوں نے اسے چلانے کے لئے بڑے بڑے چندے دینے کا اعلان کیا تھا۔ وہ سب چپ سادھ گئے، آمدنی کی کمی کی وجہ سے کالج کی حالت پتلی تھی، سٹاف کم تھا اور جو تھا اس کی تنخواہیں بھی قلیل تھیں۔ اچھے اساتذہ سب رخصت ہو گئے۔ فرحت انجینئر بننا چاہتے تھے۔ لیکن ہندو کالج انہیں لے ڈوبا۔ مجبوراً انہیں سائنس اور ریاضی چھوڑ کر عربی وغیرہ جیسے مضامین اختیار کرنے پڑے۔ مرزا فرحت بڑے شوخ اور شریر اور تیز طرار شخص تھے۔ کالج کے زمانے میں ہم جماعتوں پر پھبتیاں کسنے۔ اور انہیں چھیڑتے رہنا ان کا محبوب شغل تھا۔ موزوں طبع تھے اگر کسی کی کمزوری ہاتھ آجاتی تو اسے خوب بناتے، اس کی شان میں ہجویہ قصیدے لکھتے۔ یہاں تک کہ اس کے ناک میں دم کر دیتے۔ بہت بے تکلف اور یار باش آدمی تھے۔ دوستوں اور ساتھیوں میں بڑے ہر دلعزیز تھے۔

جیسا کہ گذشتہ سطور میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ فرحت ہونہار طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ کھیلوں کے بھی بہت شوقین تھے۔ فٹ بال بھی کھیلتے تھے لیکن

کرکٹ سے زیادہ شوق تھا۔ بڑی اچھی گیند پھینکتے تھے۔ آپ اپنی ذہانت، سادگی، شوخی اور کرکٹ کے شوق کی وجہ سے اپنے انگریز اساتذہ میں بڑی محبت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ ایک دفعہ کالج کی ٹیم کا انگریز عہدہ داروں کی ٹیم سے جس میں فوجی اور سول حکام شامل تھے، میچ ہو رہا تھا۔ کالج کی ٹیم نے دو سو رنز بنائی تھیں لیکن انگریز ٹیم کے چھٹے اور ساتویں کھلاڑی ایسے اکھڑ جے کہ اسکور ۱۸۰ سے اوپر ہوگیا۔ کالج کی ٹیم کو جیتنے کی امید نہ رہی سب دوڑ دوڑ کر ڈھیلے پڑ چکے تھے۔ فرحت نے جب یہ حال دیکھا تو للکار کر کہا (Lift up your hearts Comra-
(des) اور بڑے جوش سے گیند پھینکنا شروع کی اور ایک ہی اور (over) میں پے در پے تین کھلاڑیوں کو آؤٹ کیا۔ کرکٹ کا شوق انہیں حیدرآباد میں ملازمت کے زمانہ میں بھی رہا۔ جب آپ کی شادی میرزا ساجد بیگ کی بڑی صاحبزادی سے گلبرگہ میں ہوئی تو دوسرے دن آپ نے اس کرکٹ میچ میں جو براتیوں کی تفریح کے لئے کھیلا گیا تھا، گیند پھینکنے کا کمال دکھا کر حاضرین کو محظوظ کیا۔ کالج کی چار دیواری سے باہر بھی کھیل کے میدان میں مرزا فرحت بڑے مقبول تھے۔ کالج میں ایک سال تک آپ کالج کی کرکٹ ٹیم کے کپتان بھی رہے۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے عملی زندگی کے میدان میں قدم رکھا اور ریاست حیدرآباد میں ایک اسکول کی ماسٹری سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ تنخواہ ساٹھ روپے ماہوار تھی۔ ڈراموں میں اداکاری سے شروع ہی سے دلچسپی تھی یہاں آکر آپ نے ڈرامیٹک کلب کی بنیاد رکھی اور خود بھی اس سلسلے میں اسکول میں سٹیج کرنے کے لئے ڈرامے لکھے۔ آغا حشر کاشمیری

سے ان کی بڑی دوستی تھی ۔ مرزا فرحت نے کئی ڈرامے لکھے۔ ایک خاموش فلم کے لئے لکھا، دوسرا بولتی فلم کے لئے، اس دوسرے کو فلمانے کے لئے ایک فلمساز نے بات بھی شروع کی لیکن وہ کچھ رد و بدل کرنا چاہتا ہے ۔ مرزا صاحب راضی نہ ہوئے اور بات آگے نہ بڑھ سکی۔

آپ کو مصوری کا بھی بڑا شوق تھا۔ دہلی کے مشہور و معروف مصور استاد عارف کے شاگرد بھی رہے تھے ۔ مرزا صاحب مصوری میں پرانی روش پر چلتے تھے ۔ بڑی محنت اور جانفشانی سے تصویریں بناتے تھے اور انہیں جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے ۔ تصویر بنانے کے لئے جدید قسم کے برش کو ہاتھ بھی نہ لگاتے تھے ۔ بلکہ گلہری کی دم سے برش تیار کرتے تھے ۔ اور کسی دوسرے کو اُسے چھونے بھی نہ دیتے تھے ۔

کتب بینی کا شوق اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ کسی مزیدار کتاب کے ہاتھ آجانے پر تمام پروگرام منسوخ کر دیتے تھے ، کھانا بھی توجہ سے نہیں کھاتے تھے ایک ہاتھ سے نوالہ توڑ کر منہ میں ڈالتے اور دوسرے ہاتھ سے کتاب تھامے رہتے اور نگاہیں اوراق پر گڑی ہوتی تھیں ۔ مرزا فرحت کی طبیعت میں، محبت ہمدردی ، خدا ترسی کا مادہ بہت تھا ۔ پہلی بیوی سے (جو تقریباً چار سال زندہ رہیں) محبت کا یہ عالم تھا کہ ان کے انتقال کے بعد، دفتر سے آتے تو چائے پی کر پیدل قبرستان جاتے جو تین میل دور تھا ۔ فقط فاتحہ پڑھنے کی خاطر ۔ پہلی بیوی کی وفات کے بعد آپ کی شادی اسی خاندان میں مرحومہ کی چھوٹی بہن سے ہوئی ۔ آخر زمانے میں بڑے بیٹے کی لڑکی سے بہت محبت تھی ، اسے اپنے پاس ہی رکھ لیا تھا ۔ کسی وقت جدا نہ کرتے تھے ۔ دوسروں سے بھی اسی طرح محبت کرتے تھے ۔ رشتے کے بہن بھائیوں میں سے کوئی بیمار

ہوتا تو دن میں دو دو دفعہ بیمار پرسی کرنے جاتے۔

مرزا فرحت کی طبیعت میں گھبراہٹ اور جلد بازی بہت تھی۔ بعد میں جب جج بنے تو بڑے بڑے مقدمات ایک ہی نشست میں ختم کر لیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کچھ کرنے کا ارادہ کر لیتے تھے تو رُک نہیں سکتے تھے۔ اگر کچھ احباب کو ساتھ لے کر چلنا ہوتا تھا تو ان کو سانس نہیں لینے دیتے تھے، منٹ منٹ کے بعد جلدی تیار ہونے اور چلنے کا تقاضا کرتے۔ اگر کسی دکان میں کوئی ساتھی کچھ خریدنا چاہتا ہے۔ اور یہ بیکار کھڑے ہیں تو سمجھئے کہ قیامت آگئی۔ یہ نہ اسے دکاندار سے بات کرنے دیں گے اور نہ ٹھیک طرح سے دیکھنے کی فرصت۔ بس انچی جلدی مچائے رکھیں گے۔

مرزا فرحت بڑے پُر خلوص اور بے تکلف شخص تھے۔ جو دل میں آتا تھا فوراً زبان پر لے آتے تھے۔ ظاہر داری، بناوٹ اور تکلف ان میں نام کو نہ تھا اس سلسلے میں موقع اور محل کا بھی خیال نہ کرتے تھے۔ عموماً سب کو "تم" سے مخاطب کرتے تھے۔ جن سے زیادہ دوستی تھی انہیں "تو" کہہ کر پکارتے۔ بھری محفلوں میں بھی جب وہ یہی طریقہ اختیار کرتے تو ان کے بعض مخاطبین جو اپنے تئیں اعلیٰ شخصیت سمجھتے تھے، رنجیدہ ہو جاتے تھے لیکن مرزا صاحب کو اس امر کا احساس نہ تھا۔ وہ ہر جگہ، عموماً سب لوگوں سے اسی طرح بات کرتے تھے۔

ہمدردی، حسن سلوک، اعانت اور امداد کا جذبہ مرزا صاحب میں بہت تھا۔ کسی عزیز کو فکر مند دیکھتے تو فوراً پوچھتے کہ کیا تجھ کو کسی چیز کی ضرورت ہے؟ مجھ سے لے لے چپکے سے دے دیتے۔ کوئی قرض مانگتا تو بڑی خوشی سے دیتے۔ لیکن طبیعت میں چونکہ جلدی تھی اس لئے وصول کرنے میں

بھی عجلت سے کام لیتے۔ اور قرض دار کے وعدے کے دن پر، فوراً تقاضا کرتے۔ یہ دوسروں ہی کے معاملہ میں نہ تھا خود بھی قرض چکانے میں جلد باز تھے۔ جن دکان داروں سے ماہ بہ ماہ کا حساب تھا۔ پہلی تاریخ کو تنخواہ ملتے ہی اُنکے یہاں جا دھمکتے۔ اگر کسی دکان دار نے کہا آپ کا حساب تیار نہیں ہُوا تو اصرار کرکے بل بنواتے، جب تک پوری رقم ادا نہ کر دیتے چین نہ لیتے۔ آپ تنگ دل نہیں تھے لیکن معاملے کے صاف تھے اور جتا دیا کرتے تھے کہ حساب کوڑی کوڑی کا ہونا چاہیئے۔ ان کے ایک عزیز مرزا حسین احمد بیگ جب بھی ان کے پاس ان کے قیام دہلی کے زمانے میں گئے تو ان کے تمام اخراجات خود برداشت کئے۔ ان کے اصرار کے باوجود ان کا ایک پیسہ خرچ نہ ہونے دیا۔ لیکن اس کے برعکس وہ لکھتے ہیں کہ سالانہ مقامی نمائش میں اگر میرا دو آنے کا ٹکٹ انہوں نے کبھی خریدا تو فوراً تقاضا کر کے دو آنے وصول کر لئے اور جب میں نے ان کا داخلہ ٹکٹ لے لیا تو فوراً بٹوہ کھول اندر جانے سے پہلے پیسے ادا کر دیئے۔

آپ نے اکثر غریبوں اور بیواؤں کی تنخواہیں مقرر کر رکھی تھیں۔ تنخواہ آتے ہی پہلے ان کا حصہ نکال کر انہیں باقاعدگی سے بھیجتے تھے۔ ان کے ایک مرحوم چچا کا ایک پروردہ نابینا ہو گیا تھا۔ اس کو آپ نے اپنے پاس رکھا۔ اپنے لئے جب مکان بنوایا تو اس کے لئے اس میں ایک کمرہ اور برآمدہ خصوصاً تعمیر کروایا اس کے رہنے سہنے، اور کھانے کپڑے کا ایسا انتظام تھا کہ لوگ اسے ان کے خاندان کا فرد سمجھتے تھے۔ اس کو ظاہرا جو تنخواہ دیتے تھے، اس کے علاوہ چھپا کر بھی ایک مختصر رقم دیا کرتے تھے لیکن ہمیشہ تاکید کرتے کہ اس کا کسی سے ذکر نہ کرنا ورنہ اسی روز سے بند کر دوں گا۔

ایک مرتبہ آپ کسی سے ملنے ایک جگہ گئے۔ مغرب کی نماز قریب کی چھوٹی سی

مسجد میں ادا کی جہاں چند نمازی ہی تھے۔ مسجد کا امام بہت غریب تھا۔ اس کی حالت بڑی خستہ اور سقیم تھی۔ کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ جب سب نمازی چلے گئے تو اپنے ساتھی سے (جو وظیفہ پڑھنے میں مشغول تھا) چھپ کر، ادھر اُدھر دیکھ کر، کہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا جیب سے چند نوٹ نکالے اور چپکے سے امام صاحب کی جانماز کے نیچے رکھ دیئے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ زندہ دل اور وسیع القلب انسان تھے۔ روپے پیسے کے خرچ میں شروع سے آخر تک ان کا یہی طریقہ رہا۔ دوستوں، عزیزوں کی مدد کرنے سے کبھی ہچکچاتے نہیں تھے۔ جب تنخواہ کم تھی تب بھی پرواہ نہیں تھی۔ اور جب زیادہ ہوئی اس وقت بھی کوئی پیسہ نہ بچا سکے۔ ملازمت کا آغاز حیدر آباد میں چادر گھاٹ سکول میں اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹری سے کیا۔ یہاں آپ لڑکوں میں اپنی ڈرامہ پسندی کی وجہ سے بڑے مقبول ہوئے۔ سکول کی ملازمت کے کچھ عرصہ بعد رشتہ عدالت میں منتقل ہو گئے۔ ایک سو پچاس روپے ماہوار سے کام کا آغاز کیا۔ مترجم بھی رہے اور دفتر کے منتظم بھی اسی دوران میں سررشتے کے قانونی امتحان میں بیٹھے اور درجہ اعلیٰ میں سب سے زیادہ نمبر لے کر کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد بہت عرصے تک سپیشل مجسٹریٹی کے عہدے پر فائز رہے۔ مقدمات کی تکمیل میں غیر معمولی محنت سے کام لیتے تھے۔ اکثر عدالت کے اوقات مقررہ سے زیادہ کام کر کے مقدمات کو ختم کرتے۔ کچھ عرصے تک ہائیکورٹ کے رجسٹرار بھی رہے۔ پھر اسسٹنٹ ہوم سیکرٹری بنا دیئے گئے۔ حکومت نے ان کے انتظامی کام کو بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا چنانچہ وہ بڑے کمیشنوں میں انہیں سیکرٹری بنایا گیا۔ گلبرگہ میں کافی عرصہ سیشن جج بھی رہے پھر آپ انسپکٹر جنرل آف کورٹ مقرر ہوئے یہ عہدہ ہائیکورٹ کے جج کے برابر سمجھا جاتا

تھا۔ اور تنخواہ بھی اتنی ہی تھی۔

آپ نے دل کے عارضے سے ۲۷ر اپریل ۱۹۴۷ء کو وفات پائی۔ غیر معمولی محنت نے عرصے سے صحت کو خراب کر رکھا تھا۔ طبیب آرام سے بسر کرنے کی تاکید کرتے اور پرہیز بتاتے تھے۔ تمباکو نہ پیئیں، گوشت نہ کھائیں لیکن آپ اپنی عادتوں کے سلسلے میں انتہا پسند تھے۔ سرکاری کاموں کے سلسلے میں دُور دَور کا دورہ کرتے تھے۔ کوئی منع کرتا، صحت کی طرف توجہ دلاتا اور ڈاکٹروں کے مشورے یاد دلاتا تو کہتے: "میاں! موت کا دن مقرر ہے، کس کس چیز سے پرہیز کروں، ڈاکٹر تو منع کیا ہی کرتے ہیں۔"

ابتدائی زمانے میں سینما دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اس سلسلے کا ایک دلچسپ واقعہ سنئے۔

ان کے ایک رشتے کے بھائی میرزا حسین احمد بیگ لکھتے ہیں۔ ایک دن سینما بینی کے شوق نے جان ہی لے لی ہوتی۔ ۱۹۱۱ء کے دہلی دربار کے لئے حیدر آباد سے آئے ہوئے تھے۔ میں علی گڑھ سے دہلی چلا گیا تھا۔ ایک روز سہ پہر میں سیر کرتے ہوئے دُور نکل گئے۔ سرِ شام واپسی کا خیال تھا، اس لئے جسٹر نہیں رکھا۔ واپسی میں ایک سینما گھر پر سے گذرے۔ لوگوں کو جاتے ہوئے دیکھ کر بے اختیار ہو گئے۔ ان کے شوق کا اندازہ کر کے میں نے بھی عذر نہیں کیا۔ پہلے شو کا وقت تھا۔ فارغ ہو کر کچھ آگے گئے تھے کہ ایک دوسرے سینما گھر پر سے گذرے۔ اصرار کیا کہ اسے بھی دیکھ لو۔ میں نے کہا رات زیادہ ہو جائے گی گرم لباس ساتھ نہیں۔ سردی میں اکڑ جائیں گے۔ مگر وہ کب مانتے تھے کہنے لگے "خدا مالک ہے تم چلو تو سہی" مثل مشہور ہے۔ "مردہ بدست زندہ" بادلِ نخواستہ میں نے قبول کر لیا۔ تماشا ختم ہونے پر جب باہر نکلے تو خدا ہی یاد آگیا۔ دل کی کیفیت یہ کہ اب بیٹھ ہی

جائے گا۔ گورے سپاہیوں کو دیکھا کہ سردی سے بچنے کے لئے دوڑ لگا رہے ہیں۔ مجھ سے کہا: "بس زندہ رہنے کی یہی ایک ترکیب ہے۔ فرنگ دوڑتے چلو، اب جو دوڑ شروع کی تو کشمیری دروازے تک دوڑتے ہی رہے۔ عادت نہ ہونے سے خستہ حال ہوگئے۔ وہاں ایک دکان چائے کی تھی۔ بیٹھ کر چائے پی۔ پھر جو دوڑے تو ریل کے پل کے پاس دم لیا۔ وہاں بھی چائے کا دور رہا۔ الغرض چوڑی والوں تک یہی پروگرام رہا۔"

کلب وغیرہ جانے اور اسی طرح کے دیگر تفریحی اور ادبی مشاغل میں شروع سے آخر تک حصہ لیتے رہے۔ مگر گر کے قیام میں آپ مذہب کے سختی سے پابند ہوگئے تھے۔ اور یہ پابندی آخر دم تک باقی رہی۔ ربیع الاول کے مہینے میں ہر سال ایک نئی نعت لکھتے تھے، جو قلعے کی مسجد کی محفل میں پڑھی جاتی تھی۔ مگر بھی بارھویں تاریخ کی شب کو بیدار رہتے تھے اور صبح چار بجے نہایت پُر درد لہجے میں دعائیہ نظم پڑھتے تھے جس میں ان کے بچے بھی شریک رہتے تھے۔

مرزا فرحت رہنے سہنے اور پہننے وغیرہ کے سلسلے میں بڑے سادہ تھے۔ آرام کرسی یا صوفے وغیرہ پر ان کو کبھی آرام نہیں ملتا تھا۔ ہمیشہ کہا کرتے تھے۔ کہ جو مزا زمین پر لوٹ مارنے میں ہے۔ وہ کرسیوں اور صوفوں میں نہیں۔ البتہ رات کو نواڑی پلنگ پر سوتے تھے۔ دن میں اکثر فرش پر یا تخت پر لیٹتے تھے۔ لکھنے پڑھنے کا کام بھی زمین پر ہی ہوتا تھا۔ کبھی لیٹے کے بل لیٹے لکھ رہے ہیں کبھی اکڑوں بیٹھے ہوئے ـــــ لکھتے وقت شریک حیات اکثر سامنے بیٹھی ہوا کرتی تھیں وہ پان بنا بنا کر دے رہی ہیں۔ اور آپ اپنا کام کر رہے ہیں۔ چاہے وہ مقدمات وغیرہ ہوں یا کوئی ادبی مضمون، بچے بھی عموماً ادھر ادھر شور مچاتے پھرتے رہا کرتے تھے۔ لیکن آپ اپنے کام میں اتنے محو ہوتے تھے کہ شور سنتا ہی نہیں تھا

لباس کے معاملہ میں تکلف اور فیشن کے بالکل قائل نہ تھے۔ یورپین طرز کے کپڑوں کی طرف رغبت نہ تھی۔ شیروانی بہت پسند تھی۔ بنیان بالکل استعمال نہ کرتے تھے۔ احباب نے اصرار کرکے ملاقات کا کمرہ مغربی تہذیب کے مطابق آراستہ کرا دیا تھا۔ لیکن اس کے استعمال کی نوبت بہت ہی کم آتی تھی۔ وہی کمرہ ملاقاتیوں کی آماجگاہ بنتا تھا۔ جہاں زمین پر فرش بچھا ہوا تھا اور لاتعداد چھوٹے بڑے تکیے رکھے رہتے تھے۔

مرزا فرحت کی طبیعت میں خوش طبعی زندہ دلی اور ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اپنی باتوں سے اپنی زندگی میں دوستوں کو ہنسایا کرتے تھے اور ان کے مضامین ان کے بعد بھی ہنسنے ہنسانے کا، خوش طبعی اور زندہ دلی سکھانے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ اپنی تہذیب سے انہیں محبت تھی۔ اور وہ چاہتے تھے کہ اپنے مضامین میں اس تہذیب اور اس تہذیب کے لوگوں کو حیاتِ جاودانی سے ہمکنار کر دیں۔ بلاشبہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہیں۔ جس محبت کے ساتھ انہوں نے اپنی پسندیدہ معاشرت کو اپنی تحریروں میں زندہ کیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے ؎

کس طرح دہرائیں تیرے وصف تیری خوبیاں
تیرے ہر انداز سے انداز مشرق تھا عیاں

بشیر النساء بیگم

مزاح اور مزاحیہ تحریر

ہنسنے کی اہمیت یا ضرورت: سنجیدگی کائنات کے ہر شعبے پر حاوی ہے اور زندگی کے تمام اجزاء میں اس کی جڑیں دُور دُور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ زندگی کے کارخانے کی تمام کلیں سنجیدگی سے ہم آہنگ ہو کر حرکت کرتی ہیں اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ متانت یا سنجیدگی گویا ایندھن ہے جو اس حرکت و توانائی کا باعث ہے۔ سنجیدگی ایک دبیز تہہ کی طرح کائنات کو لپیٹے ہوئے ہے۔ جس میں انسان کا بھی یہی رنگ اختیار کر کے ایک مشینی انداز اختیار کر لینا بالکل فطری ہے۔

احساسِ مزاح، سنجیدگی کی اس گھمبیرتا کو کم کرنے اور زندگی پر حاوی متانت کے ٹھوس پن اور ماحول کی سختی کو نرم کرنے اور پگھلانے کا بہترین وسیلہ ہے۔ یہ ایک ایسا ہتھیار ہے جس کی مدد سے انسان اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے کے لئے جدوجہد کرتا ہے تاکہ کہیں وہ زندگی کی سنجیدہ کاوش اور جدوجہد میں دیوانہ وار منہمک رہ کر خود بھی فطرت کے مشینی نظام کا حصّہ نہ بن جائے۔

احساسِ مزاح زندگی کی سختیوں کو قابلِ برداشت بنانے میں ہماری بڑی مدد کرتا ہے۔ انسان خوابوں کی بنیاد پر اپنی امنگوں، آرزوؤں کے خوبصورت جال بُنتے بُنتے ان میں کھو جاتا ہے اور طرح طرح کی خوش فہمیوں کے رنگ محل تیار کر کے خود کو ان کے اندر قید کر لیتا ہے۔ لیکن جب اس کی آرزوؤں اور حسین خواہشوں کے یہ تاج محل، کسی نہ کسی موقعے پر جلد یا بدیر زندگی کے سنگین اور ٹھوس

حقائق کے دیو قامت پتھروں سے ٹکراتے ہیں اور ریزہ ریزہ ہوجاتے ہیں تو اسے بے انتہا مایوسی ہوتی ہے۔ اس کے تخیل کے شیش محل چکنا چور ہوجاتے ہیں تو اس کی بے بسی و بے کسی کا احساس اس پر اس درجہ غالب آجاتا ہے کہ وہ بسا اوقات خودکشی کے ذریعے اپنی مایوس زندگی کا گلا گھونٹنے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔ زندگی کی رنگینیوں، رعنائیوں اور دلفریبیوں کو وہ صرف تخیل ہی کی دنیا میں حاصل کرسکتا ہے کیونکہ حقیقی زندگی میں حالات اس کا ساتھ نہیں دے رہے اور جب تخیل، حقیقت سے ٹکرا کر پاش پاش ہوجاتا ہے تو اسے خودکشی کے سوا کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا۔ یا پھر کچھ اور مقامات اسے نظر آتے ہیں۔ اور ان مقامات کو پالینے کے لئے وہ زندگی کی جدوجہد سے کنارہ کشی اختیار کرلیتا ہے یا پھر اس دنیا میں رہتے رہتے، اپنی الگ تنہائی کی دنیا بسا لیتا ہے۔ ایسے اور اسی قسم کے دوسرے موقعوں پر احساس مزاح یا مزاح یا اسی قبیل کی دوسری چیزیں اسکو ایک نارمل انسان بنانے میں مدد دیتی ہیں۔ اور سوسائٹی کی سیدھی راہ سے بھٹکنے والے اس شخص کو پھر سوسائٹی میں ملانے کے لئے حرکت میں آجاتی ہیں ——— مزاح کا یہ کام ایک بہت بڑی انسانی خدمت ہے کہ وہ انسان کی بے لگام آرزوؤں، شتر بے مہار امنگوں اور پر اسرار خوابوں، اور محض تخیلاتی کاوشوں پر تنقید کرکے متبسم انداز میں اسے حقائق دوچار کرتا ہے۔ اور اسے مایوسی کے چنگل میں پھنسنے سے بچاتا ہے۔

مزاح کا تجزیہ: فرائڈ نے مزاح[1] کی چار صورتیں پیش کی ہیں۔

۱۔ **بے ضرر لطائف:** جن کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ الفاظ یا افکار کی

---

[1] بحوالہ۔ اردو ادب میں طنز و مزاح۔ ڈاکٹر وزیر آغا۔

جادوگری سے تفریحِ طبع کا باعث بنیں۔

۴۔ افادی لطائف: ان کا طریقِ کار بے ضرر لطائف والا ہی ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ کسی جنسی یا تشدد آمیز خواہش کی تسکین کا سامان بھی بہم پہنچاتے ہیں۔

فرائڈ کے مطابق بے ضرر لطائف سے مسرت اس لئے حاصل ہوتی ہے کہ انسان کے ذریعے اپنے بچپن کے ماحول میں واپس پہنچ جاتا ہے اور وہی طریقِ فکر و استدلال اختیار کرتا ہے۔ یوں عام زندگی بسر کرنے کے لئے جو ضروری قوت درکار ہوتی ہے اس میں ایک بچت (Economy) پیدا ہو جاتی ہے اور یہ بچت ہنسی کی صورت میں بہہ نکلتی ہے۔ اس کے برعکس افادی لطائف ان جنسی یا تشدد آمیز خواہشات کو آزاد کرتے ہیں جو عام زندگی میں ماحول اور سوسائٹی سے ہم آہنگ نہ ہونے کی صورت میں دبائی جا چکی ہیں۔ گریگ نے فرائڈ کے بنیادی نظریوں سے اتفاق کیا ہے۔ لیکن اس نے مزاح کے پس پشت فرائڈ کی پیش کردہ جنسی یا تشدد آمیز خواہش کی بجائے محبت یا نفرت کے جذبات کو نمایاں جگہ دی ہے۔ بہرحال مزاح کی اس دوسری صورت کے پس پشت محبت یا نفرت کے جذبات ہوں یا جنسی یا تشدد آمیز خواہشات، چونکہ عام زندگی میں ہم ان رجحانات کی کھلے بندوں تسکین نہیں کر سکتے۔ لہٰذا یہ مزاح کے ذریعے اس انداز سے تسکین حاصل کر لیتے ہیں کہ سوسائٹی کی اقدار کو کوئی صدمہ نہیں پہنچتا۔ اور ان جذبات کی تسکین، ان لطائف کے ذریعے، ان جذبات کو دبا دینے والی قوت (Repressive Energy) میں بچت پیدا کرتی ہے۔ عام حالات میں اگر ان خواہشات کی تسکین نہ ہوتی تو یہ قوت بڑی ضروری تھی۔ اب جو اس میں بچت پیدا ہوئی تو یہ ہنسی کی صورت

میں بہہ نکلی۔

مزاح کی تیسری صورت مضحک سے متعلق ہے۔ مضحک سے حصولِ مسرت کے متعلق فرائڈ نے لکھا ہے کہ یہاں مسرت قوتِ تخیل ———————— ؟
———— میں بچت سے پیدا ہوتی ہے اور وہ اس طرح کہ مضحک تحریک ہمیں یہ یقین دلاتی ہے کہ ایک خاص کام کی تکمیل کے لئے ہمیں اس قدر قوت کی ضرورت ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ ہمیں بہت جلد اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ یہ کام تو اس سے بہت کم قوت کے صرف سے بھی انجام دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ فاضل قوت ہنسی کی صورت میں بہہ نکلتی ہے۔ "کھودا پہاڑ نکلا چوہا" اس کی بہترین مثال ہے۔

آخر میں فرائڈ نے خالص مزاح کا ذکر کیا ہے۔ اس سے حصولِ مسرت کو قوتِ جذبات میں (Emotioral Energy) بچت کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ مثال کے طور پر الف ایک مصیبت میں گرفتار ہے اور ب کو اس سے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے لیکن الف کی کسی بات سے ب کو محسوس ہوتا ہے کہ الف اپنی مصیبت کا مذاق اڑا رہا ہے تو ب بھی الف کا ہم نوا بن جاتا ہے اور یوں ب کی جمع شدہ ہمدردی میں ایک بچت پیدا ہوتی ہے اور یہ بچت ہنسی کی صورت میں بہہ نکلتی ہے۔

مزاح کی مختلف قسمیں، ہنسانے کے مختلف طریقے :

مزاح نگاری کا جائزہ لینے پر ہمارے سامنے مزاحیہ تخلیقات کی مندرجہ ذیل اقسام آتی ہیں۔

۱۔ خالص مزاح (Humour) طنز (Sative) تحریف (Parody) رمز (Irony) ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے۔ ہنسنے

سنسانفے کی اِن مختلف اقسام میں کون کون سے طریقے برتے جاتے ہیں۔ یا دوسرے لفظوں میں کہہ لیجئے کہ ہم اس امر کا تجزیہ کریں گے کہ مزاح نگاری کی ان مختلف اصناف میں وہ کونسی خصوصیات ہیں جو انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ کرتی ہیں۔

مزاح (Humour) لی کاک (Lea cock) نے مزاح کی یہ تعریف کی ہے "یہ زندگی کی ناہمواریوں کے اس ہمدردانہ شعور کا نام ہے جس کا اظہار فنکارانہ طریقے سے ہو"۔ اس کا مطلب یہ ہُوا کہ مزاح نگار کے لئے سب سے پہلے باشعور ہونا ضروری ہے۔ اس طرح کا باشعور کہ وہ اپنی نگاہ وہ بین سے زندگی کی ان ناہمواریوں اور مضحک حالتوں کو دیکھ سکے جو عام نگاہوں سے پوشیدہ رہتی ہیں۔ ہوسکتا ہے ایک آدمی کی نگاہ اِن باتوں تک پہنچ جائے! لیکن اتنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کی نگاہ میں ہمدردی کا ہونا بھی ضروری ہے تاکہ اس کے ردِ عمل میں استہزائی کیفیت پیدا نہ ہو۔ نفرت یا حقارت کے جذبات نہ ابھریں۔ بلکہ اس کا زاویۂ نظر ہمدردانہ ہو وہ انہیں ناپسند کرنے کی بجائے، ان سے محظوظ ہو یعنی مزاح نگار جہاں ناہمواریوں کا شعور رکھتا ہے وہاں وہ اس ماحول سے نفرت نہیں کرتا جس ماحول نے انہیں جنم دیا۔ اگر وہ نفرت کرے گا تو اس کا زاویۂ نگاہ ہمدردانہ نہیں ہوگا۔ اب لی کاک کی تعریف کے دوسرے حصے پر غور کیجئے یعنی مزاح نگار کے لئے جہاں مندرجہ بالا باتیں ضروری ہیں وہاں یہ بات بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے تجربات کے اظہار میں فنکارانہ انداز اختیار کرے۔ سیدھے سادے اور سپاٹ طریقے سے اگر وہ زندگی کی ناہمواریوں کو پیش کرے گا تو مزاح پھیکا نہ ہوسکے گا۔

طنز :—— (Satire) طنز نگار کے لئے بھی مزاح نگار کی طرح

زندگی کی ناہمواریوں کی تہہ تک پہنچنا ضروری ہے لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ جہاں مزاح نگار کا نقطۂ نظر ہمدردانہ ہوتا ہے وہاں طنز نگار کو اس شخص سے ہمدردی نہیں ہوتی جس کا وہ تمسخر اڑاتا ہے۔ اور بقول رونالڈ ناکس ۔ ۔ ۔ (Ronald Knox) دونوں کا بنیادی فرق اس طرح کا ہے کہ مزاح نگار ہرن کے ساتھ بھاگتا ہے لیکن طنز نگار کتوں کے ساتھ شکار کھیلتا ہے۔ یعنی مزاح نگار جہاں محظوظ ہونا مقدم سمجھتا ہے طنز نگار وہاں ناہمواریوں سے نفرت کرتا ہے اور انہیں تضحیک کا نشانہ بنا بنا کر سامنے لاتا ہے۔

تحریف (Parody) تحریف یا پیروڈی میں طنز اور مزاح دونوں اصناف کے طریق ہائے کار استعمال کئے جاتے ہیں۔ پیروڈی کسی کلام یا تصنیف کی لفظی نقالی اور معنوی تضحیک کا نام ہے پیروڈی سے طنز و مزاح کے ملے جلے طریقوں سے ادبی یا نظریاتی ـــــ یا سیاسی و سماجی خامیاں منظر عام پر لانے کا کام لیا جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ اصل تصنیف میں لفظی تبدیلیاں کر کے یا اس کے نفس مضمون میں رد و بدل کر کے تفریح طبع کا سامان بھی بہم پہنچاتی ہے اور اس کے علاوہ اس تصنیف میں بیان کئے جانے والے خیالات و نظریات کی خامیوں کو مضحک انداز میں سامنے لاتی ہے۔ پیروڈی میں اصل تصنیف یا کلام کی جذباتیت کو مجروح کرنے کے لئے اس میں لفظی تبدیلیاں کر کے اس کی سنجیدگی ختم کر دی جاتی ہے۔ پیروڈی کے لئے ضروری ہے کہ وہ جس چیز کی تحریف ہو وہ مقبول ہو۔

رمز (Irony) کا طریق کار یہ ہے کہ اس میں مخالف کے طرز استدلال اس کے نظریات اور اس کے بیان کو بظاہر تسلیم کرتے ہوئے یوں پیش کیا جاتا ہے کہ اس کے کمزور پہلو نمایاں ہو جائیں۔ رمز نگار بظاہر کسی چیز کا ذکر بڑی

عقیدت اور سنجیدگی سے کرتا ہے لیکن در پردہ اس کی جڑوں پر وار کر کے انہیں کاٹتا چلا جاتا ہے۔ رمز کا طنز سے بہت قریبی تعلق ہے۔ طنز کی طرح اس میں بھی کسی پر کیچڑ اچھالنا مقصود نہیں ہوتا۔ طنز کے لئے مزاح سے قریب ہونا بڑا ضروری ہے۔ اس میں دو سروں کے عیب ضرور نمایاں کئے جاتے ہیں۔ برائیوں کو طشت از بام کیا جاتا ہے لیکن لطیف فنکارانہ پیرایہ میں۔ اور یہ کہ طنز میں کسی خاص فرد کی عیوب کی پردہ دری کو زندگی اور سماج کی عالمگیر ناہمواریوں کی پردہ دری کا وسیلہ بنایا جاتا ہے۔ کونین کو شکر میں لپیٹ کر کھلایا جاتا ہے اور ایسا انداز ہرگز اختیار نہیں کیا جاتا کہ طنز، طنز کے دائرے سے نکل کر گالی گلوچ یا پھبتی کا انداز اختیار کرلے۔

رمز جہاں طنز سے بہت قریب ہے وہاں پیروڈی سے بھی اس کا قریبی تعلق ہے۔ اس میں رمز کرنے والا (Ironist) مخالف کے نقطۂ نظر کو اپنا کر (پیروڈی کی طرح مبالغے سے کام لینے کی بجائے کم سے کم لفظوں میں) اس طرح بیان کرتا ہے اس کی ساری کمزوریاں نمایاں ہو جاتی ہیں۔ مثلاً کسی قحط زدہ غلے کی کمی کے شکار ملک کے ایسے لیڈر کے بارے میں جس نے لوگوں کو اناج کم کھانے کی تلقین کی ہو اور یہ اعلان کر رکھا ہو کہ اس نے بھی گندم کھانا چھوڑ دی ہے۔ یہ کہا جائے "وزیر اعظم صاحب نے گندم کھانا چھوڑ دی ہے، ان کا گذارہ تو بس روزانہ دس سیبوں، بارہ انڈوں، اور آٹھ سیر گوشت کی یخنی پر ہے" مخالف کے بیان کو اس طرح اپنا کر اسے مہمل اور مضحکہ خیز طریقے سے پیش کرنا ہی رمز کرنے والے کی کامیابی ہے۔

فرحت کی مزاح نگاری کا جائزہ لینے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہ جان لیں کہ مزاح کی عمارت تعمیر کرتے وقت عموماً کس قسم کے سنگ و خشت

کو بروئے کار لایا جاتا ہے یعنی ہم یہ دیکھیں گے کہ کسی مزاحیہ تحریر میں کن وسیلوں اور حربوں سے قارئین کی ظرافت طبع کو تازیانہ لگایا جاتا ہے۔

نمبرا:۔ مزاحیہ تحریروں میں عموماً ایسی صورت حال پیدا کر دی جاتی ہے کہ نشانۂ تضحیک کی شکل اور اس کی جملہ حرکات بڑے بے ڈھنگے اور ناہموار طریقے سے ہمارے سامنے آتی ہیں اور ایک اچھا بھلا باوقار شخص عجیب وغریب صورت واقعہ کا شکار اور مختلف الجھنوں میں گرفتار دکھائی دیتا ہے۔ اس کی ناہمواری اور بے ڈھنگا پن کچھ دیر کے لئے اس کے وقار کو ختم کر کے اسے مضحکہ خیز صورت میں ہمارے سامنے اس طرح پیش کرتا ہے کہ ہمارے اندر احساس برتری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور اس کی حیثیت کذائی ہماری ہنسی کو بیدار کر دیتی ہے۔ مضامین پطرس سے ایک مثال ملاحظہ ہو۔

"اس قدر تیز رفتاری بائیسکل کی طبع نازک پہ گراں گذری چنانچہ اس میں یک لخت دو تبدیلیاں واقع ہو گئیں۔ ایک تو ہینڈل ایک طرف کو مڑ گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں جا تو سامنے رہا تھا، لیکن میرا تمام جسم بائیں طرف کو مڑا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بائیسکل کی گدی دفعتاً چھ انچ کے قریب نیچے بیٹھ گئی۔ چنانچہ جب پیڈل چلانے کے لئے میں ٹانگیں اوپر نیچے کر رہا تھا تو میرے گھٹنے ٹھوڑی تک پہنچ جاتے تھے۔ کمر دوہری ہو کر باہر کو نکلی ہوئی تھی..... میں نے مناسب یہی سمجھا کہ اس کو ٹھیک کر لوں...... جیب سے میں نے اوزار نکالا...... ٹھیک کیا اور دوبارہ سوار ہو گیا دس قدم بھی چلنے نہ پایا تھا کہ اب کی بار ہینڈل یکلخت نیچا ہو گیا۔ اتنا کہ گدی اب ہینڈل سے فٹ بھر اونچی تھی میرا تمام جسم آگے کو جھکا ہوا تھا۔ تمام بوجھ دونوں

ہاتھوں پر تھا جو ہینڈل پر رکھے ہوئے تھے۔ اور جو بہار جھٹکے کھا رہے تھے۔ آپ میری حالت کو تصور میں لائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ میں دور سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی عورت آٹا گوندھ رہی ہو۔ مجھے اس مشابہت کا احساس بہت تیز تھا۔ جس کی وجہ سے میرے ماتھے پر پسینہ پھوٹ آیا...... ہینڈل تو نیچا ہو ہی گیا تھا تھوڑی دیر کے بعد گدی بھی پھر نیچی ہو گئی اور میں ہمہ تن زمین کے قریب پہنچ گیا۔ ایک لڑکے نے کہا دیکھو یہ آدمی کیا کر رہا ہے۔ گویا اس بدتمیز کے نزدیک میں کوئی کرتب دکھا رہا تھا۔"

صورتِ واقعہ سے پیدا ہونے والے مزاح کی یہ ایک بہترین مثال ہے۔ واقعہ سے مزاح پیدا کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایسے واقعات نہ پیدا کئے جائیں جن کا گھڑا ہوا ہونا صاف صاف ظاہر ہو۔ اور وہ مصنف کی شعوری کاوش کا نتیجہ معلوم ہوں بلکہ ایسا تاثر پیدا کیا جانا ضروری ہے کہ مزاحیہ صورتِ حال بالکل فطری معلوم ہو جو خود کردار کی ناہموار حرکتوں سے معرضِ وجود میں آئے۔ اس سلسلے میں ایک اچھا مزاح نگار اتفاقی صورتِ حال، غلطی یا غلط فہمی سے کام لے کر اس قسم کے مزاح کے مواقع پیدا کر لیتا ہے اور اس کی نظر ہمیشہ اس بات پر رہتی ہے کہ مزاح میں لطافت اور گہرائی ہو۔ عملی مذاق اور دھما چوکڑی سے وہ گریز کرتا ہے جیسا کہ ہمیں خوجی کے کردار میں اکثر نظر آتا ہے دھول دھپے اور کھینچا تانی سے مزاح پیدا کرنے میں شعوری کاوش کو بہت دخل ہوتا ہے اس لئے اس سے پیدا ہونے والے مزاح میں لطافت کی بجائے کثافت یا کھردرا پن آجاتا ہے (HUMOROUS SITUATION) سے مزاح پیدا کرنے میں یہ امر بھی بطور خاص ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ اچانک ناہمواریوں اور الجھنوں میں گھرا ہوا کردار کسی دکھ یا تکلیف کا شکار نہ ہو۔ کیونکہ اگر کسی کے

لئے ناہموار صورتِ حال سخت چوٹ یا شدید صدمے کا باعث ہوگی تو ہمیں اس پر ہنسی آنے کی بجائے اس سے ہمدردی پیدا ہوگی اور واقعہ پُرمزاح ہونے کی بجائے المناک ہوکر رہ جائے گا۔

نمبر ۲ ۔ تحریر میں مزاح پیدا کرنے ایک طریقہ مزاحیہ کردار کی تخلیق ہے۔ اس قسم کے کردار کی تخلیق کے وقت اچھا مزاح نگار ایک ایسا فرد ہمارے سامنے لاتا ہے جس کا کردار لچک نہ رکھتا ہو۔ مزاحیہ کردار مسخرہ نہیں ہوتا جو اپنی الٹی سیدھی حرکات سے، شعوری طور پر سامعین کو محظوظ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بلکہ وہ بظاہر ایک باوقار، سلجھا ہوا شخص نظر آتا ہے۔ لیکن اس کی شخصیت میں یہ کمزوری ہوتی ہے کہ وہ عام انسانوں کی طرح بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ اپنے تئیں ہم آہنگ نہیں کرسکتا۔ اور اس میں احساس کمتری کو چھپانے کے لئے احساس برتری بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ لہٰذا وہ اسی قسم کی حرکات کرتا نظر آتا ہے یا ایسی گفتگو کرتا ہے جو لوگوں کی ہنسی کا موجب ہوتی ہے۔ مزاحیہ کردار کو نمایاں کرنے کے لئے مناسب قسم کا ماحول پیدا کرنا بھی بڑا ضروری ہے تاکہ اس کی ناہمواریاں نمایاں ہوکر سامنے آئیں۔ فرحت کے مضامین میں مزاحیہ کردار کی "صاحب بہادر" اور عالم بے بسی دبے کسی مزاحیہ صورت حال کی اچھی مثالیں ہیں۔ اِن دونوں مضامین کے کردار مناسب صورت حال کے پس منظر میں مزاحیہ رنگ میں رنگے ہوئے اس طرح نظر آتے ہیں کہ قارئین کی ظرافت طبع کا سامان بن جاتے ہیں یہی ایک مزاح نگار کی خوبی ہے۔ اس سلسلے میں تفصیل سے گفتگو ہم آگے چل کر کریں گے۔

مزاحیہ کردار کی ناہمواریاں چونکہ ایک خاص قسم کے ماحول اور واقعات میں گھر کر سامنے آتی ہیں اس لئے اکثر موقعوں پر مزاحیہ کردار اور مزاحیہ صورتِ

واقعہ (HUMOROUS SITUATION) ایک دوسرے کا جزو لاینفک بن کر سامنے آتے ہیں۔ جنہیں الگ الگ نہیں کیا جاسکتا۔

نمبر ۳: مزاح نگاری کا ایک اور کار آمد حربہ زبان اور اسلوب کی بازی گری ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا اس سلسلے میں لکھتے ہیں "لفظی بازی گری سے مزاح پیدا کرنے کے کئی ایک طریق ہیں جن میں شائد سب سے پرانا طریق کار تکرار (Repetition) ہے مگر اس ضمن میں جس طریق کو از منہ قدیم سے اہمیت ملی ہے، رعایت لفظی (PUN) کے نام سے مشہور ہے۔ رعایت لفظی کا مقصد یہ ہے کہ کسی لفظ کو اس انداز سے استعمال کیا جائے کہ ناظر کو اس لفظ کے دو مختلف مطالب کا احساس ہو۔ چنانچہ اس کی مدد سے بالعموم ایک ایسی بات کہی جاتی ہے جو عام انداز سے کہی جائے تو ایک شدید تر ردعمل کے سوا اور کوئی نتیجہ نہ نکلے۔ لیکن رعایتِ لفظی کے لئے جدت شرط ہے۔ ورنہ تکرار سے بالعموم اس کی مزاحیہ کیفیت انحطاط پذیر ہو جاتی ہے۔ لفظی بازی گری کا ایک اور فوری مضحکہ خیز املاسے مزاح کی تخلیق ہے لیکن اس کا افق اس وجہ سے محدود ہے کہ یہاں مضحک پہلو تک حرف انسانی آنکھ ہی رسائی حاصل کر پاتی ہے۔ ان کے علاوہ لطائف سے پیدا ہونے والا مزاح بھی بڑی حد تک الفاظ ہی کا رہین منت ہوتا ہے کیونکہ یہاں الفاظ کی بچت (ECONOMY) سے مضحک نکات کو بڑی تیزی اور شدت سے پیدا کیا جاتا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی لفظی بازی گری کے یہ تمام تو کیلے لیکن مضحکہ نکات بذلہ سنجی (WIT) کے زمرے میں شامل ہیں۔ بذلہ سنجی کو مزاح سے باآسانی تمیز کیا جاسکتا ہے اور وہ اس طرح کہ مزاح ایک کیفیت ہونے کے باعث سارے کے سارے ادب پارے میں ایک برقی رو کی طرح سرایت کر جاتا ہے اور ہم جس مقام سے اسے چھولیں، یہ برقی رو ہمیں صاف طور پر محسوس ہوتی

ہے۔ چنانچہ مزاح کو علیٰحدہ کر کے دکھانا بہت مشکل ہے۔ دوسری طرف اگر چہ بذلہ سنجی کا نمایاں ترین عنصر مزاح ہے اور اسی لئے مزاح نگار اسے حربے کے طور پر بھی استعمال کرتا ہے۔ تاہم بذلہ سنجی کا رشتہ الفاظ کے ساتھ اس قدر مضبوط ہوتا ہے کہ مزاح کے بر عکس یہ علیٰحدہ کر کے بھی دکھائی جا سکتی ہے۔[۴]

نمبر ۴ : مزاح کی تخلیق کے لئے موازنے یا مقابلے کا طریقہ بھی بروئے کار لایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں دو چیزوں کے تقابل اور موازنے سے ناہمواریاں اس طرح اجاگر کی جاتی ہیں کہ ہنسی کے فوارے چھوٹنے لگتے ہیں۔ مزاح پیدا کرنے کا یہ ایک مقبول طریقہ ہے جس میں دو چیزوں کو قارئین کے سامنے اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ ایک ہی وقت میں ان کی آپس میں مشابہت اور تضاد سے نشانۂ تضحیک چیز کا بے تکا پن اور بے ڈھنگا انداز، مضحکہ خیز طریقے سے سامنے آکر دل و دماغ میں گدگدی پیدا کر دیتا ہے۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا صاحب "عام زندگی میں موازنہ کی مثال کسی شریر آئینے کا وہ عکس ہے جو کسی فرد کے حلیے کو مضحکہ خیز حد تک" فرحت اللہ بیگ کا مضمون "نئی اور پرانی تہذیب کی ٹکر" اس کی ایک اچھی مثال ہے۔ جس کا تفصیلی جائزہ ہم آگے چل کر لیں گے۔ اسی طرح پطرس کے مضمون کتے میں بھی اس کی اچھی مثال موجود ہے۔ جہاں مشاعرے اور کتوں کے ہنگامے کے موازنے اور تضاد سے مزاح پیدا کیا گیا ہے۔

---

[۴] اردو ادب میں طنز و مزاح ص۴۴،۴۵) [۵] ایضاً ص۴۴

فرحت کی مزاح نگاری

فرحت کی مزاحیہ تحریروں کا تجزیاتی جائزہ لیتے وقت ہمیں ان کے ہاں ظرافت کے دو قسم کے اسلوب نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان میں ایک کو ادبی ظرافت یا متین مزاح کا نام دیا جاسکتا ہے۔ جسے ان کے ایک دوست، مزاح نگار اور نقاد عظمت اللہ خان نے خوش طبعی یا خوش مذاقی کا نام دیا ہے۔ اس قسم کی ظرافت ان سے پہلے اردو میں بہت ہی کم نظر آتی ہے۔ عظمت اللہ خان نے خوش مذاقی کی یہ تعریف کی ہے "اردو ادب میں جہاں اور بہت سی باتیں نابید ہیں اسی قسم کی ظرافت بھی جسے انگریزی میں "لائٹ ہیومر" کہتے ہیں اور جس کا ترجمہ ہم نے "خوش مذاقی" مناسب سمجھا ہے، بالکل مفقود ہے .... خوش مذاقی کی تعریف بہت مشکل چیز ہے۔ البتہ اس کے مفہوم کو اس طرح سمجھا سکتے ہیں کہ آپ ایک معمولی سا مضمون لکھیں کہ پڑھنے والے یہ بھی مانتے جائیں کہ آپ نے ٹھیک لکھا ہے اور ہنستے بھی جائیں۔ ہنسی کے یہ معنی نہیں کہ آدمی قہقہے کا بم ہی اڑائے، کھل کھلا کر بندوق کی باڑ سی ہی داغ دے۔ ہنسی ایک ذہنی کیفیت ہی ہے، ایک طرح کی بشاشت یا زیادہ صحت کے ساتھ یوں کہیے کہ ایک نفسی انبساط ہے اگر دل و دماغ پر ایک انبساط کی کیفیت چھا جائے اور کبھی کبھی لبوں پر مسکراہٹ کھیل جائے اور ایک آدھ دفعہ قارئین پھول کی طرح کھل کھلا کر ہنس پڑیں تو ایسا مضمون خوش مذاقی کا بہترین نمونہ ہوگا...... خوش مذاقی کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں رکاکت اور سوقیانہ پن بالکل نہ ہو.....؟

ظرافت کی مزاحیہ تحریروں خوش مذاقی کے مندرجہ بالا معیار کو قائم کرنے والے مضامین "نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ اپنی زبانی"، "ایک وصیت کی تعمیل" اور "دہلی کا ایک یادگار آخری مشاعرہ" وغیرہ ہیں۔ ان مضمونوں میں خوش مذاقی یا ادبی ظرافت اور متین مزاح کا جو اسلوب نظر آتا ہے۔ اس کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہاں مضحکہ خیز صورت حال موازنہ یا مزاحیہ کردار کی تخلیق سے ہنسانے کی سعی نہیں کی گئی بلکہ ایسا شگفتہ اور شوخ اسلوب اختیار کیا گیا ہے کہ شگفتگی اور شادابی الفاظ اور جملوں میں ہو کر تحریر کا جزو اور اسلوب کا حصہ بن کر سامنے آتی ہے۔ "یادگار مشاعرہ" سے چند مثالیں ملاحظ فرمائیں اور دیکھیں کہ ظرافت کی فطری خوش طبعی اور بشاشت کس طرح جملوں میں منتقل ہو کر سامنے آتی ہے۔

ا:- "بیٹھا ہی تھا کہ چوبدار نے آکر کہا" وہ کریم الدین کون صاحب ہیں۔ ان کو حضور والا یاد فرماتے ہیں" یہ سننا تھا کہ میرے پسینے چھوٹ گئے۔ میں سمجھا تھا کہ حکیم صاحب ہی کے پاس جا کر معاملے ہو جائے گا۔ کیا خبر تھی کہ بارگاہ جہاں پناہی میں یاد ہو گی اور یاد بھی ایسے وقت کہ میرا سانس بھی پیٹ میں پوری طرح نہیں سمایا ہو گا۔ اٹھا اور چوبدار کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔ تمام راستے آیۃ الکرسی پڑھتا رہا۔ . . . . . اندر سے قلعہ دیکھنے کا مدت سے شوق تھا۔ اب جو موقع ملا تو کن انکھیوں سے بھی دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ . . . . چوبدار جو گیا تو آنے کا نام نہیں لیتا۔ دھوپ میں کھڑے کھڑے خشار ہو گیا۔ پسینہ میں تر بتر گردن نیچی کئے کھڑا ہوں اور ناک سے پسینے کی بوندیں ٹپک رہی ہیں"

۲:- "یہاں میں اتنا ضرور کہوں گا کہ جیسے نے حضور ہی اتنا مشکل کام نہ تھا جتنا یہ الٹے پاؤں واپس ہونا۔ زمین پاؤں کو نہیں لگی تھی اس لئے دو چار قدم ہی

چلا ہوں گاگر دیوار سے ٹکر کھائی۔ اس ٹکر سے نہیں سنبھلا تھا کہ نہر میں پاؤں جا پڑا خیر بہ ہزار دقت باہر نکل ہی آیا۔"

مندرجہ بالا اقتباسات فرحت کے جن مضمون سے لئے گئے ہیں وہ ان کے خوش مذاقی والے اسٹائل سے شگفتگی اور نفسی انبساط پیدا کرنے والے جملۂ شاہکار مضمونوں میں سے ہے۔ ان سطور کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ باتیں بالکل ٹھیک ٹھاک لکھی گئی ہیں، واقعات کو زبردستی مضحکہ خیز نہیں بنایا گیا اور نہ ہی کردار کی شکل بگاڑ کر ہنسانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بلکہ ایک معمولی بات اس طرح بیان کی گئی ہے کہ آدمی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا یہی خوش طبعی یا لائٹ ہیومر ہے۔ اب کچھ سطور مولانا وحید الدین پر لکھے جانے والے مضمون "ایک وصیت کی تعمیل" سے ملاحظہ ہوں۔

۳:۔ "ان کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ اس خدمت پر کب تک ہیں اور کب نکال دئے جائیں گے۔ خشک سالی کے اندیشے سے ارزانی کے زمانے میں کھتے بھرنے کی فکر میں رہے۔ خود چل بسے اور جمع پونجی دوسروں کے لئے چھوڑ گئے اور چھوڑ بھی اتنی گئے کہ بعض لوگوں کو افسوس ہوا کہ ہم ان کے بیٹے کیوں نہ ہوئے۔"

۴:۔ "یہ کبھی تو ہنس کر چپ ہو جاتے تھے، کبھی صرف جھڑک دیتے، کبھی جل کر کہتے: "جی ہاں میرے والد تھے۔ کچھ آپ کا دینا آتا ہے۔"

۵:۔ مولوی صاحب بیٹھے ہیں۔ سامنے دو انگیٹھیاں رکھی ہیں، ایک پر پانی دوسری پر دودھ جوش ہو رہا ہے، چائے بن رہی ہے، خود پی رہے ہیں، دوسروں کو پلا رہے ہیں۔ ایک نمک کا ڈلا پاس رکھا ہے۔ چائے بنائی، نمک کے ڈلے کو ڈال، دو ایک چکر دے نکال لیا۔ بس سارے دن ان کا یہی شغل تھا۔ گھر میں برتن ہی نہیں تھے، کھانا کیسے پکتا۔ خبر نہیں کہاں جا کر کھا پی آتے تھے۔

کبھی میں گیا : دیکھا کہ دروازے میں یہ بڑا قفل لٹک رہا ہے، سمجھ گیا کہ مولوی صاحب کہیں چرنے چگنے تشریف لے گئے؟"

۶ - چائے بنائی ، پی پی ، ادھر ادھر گئے ، پیٹ بھر لیا ، گھر آئے ، بان کی کھری چارپائی پر لوٹ ماری ۔ چیلوز ندگی کا ایک دن کٹ گیا ۔ ان کی بان کی چارپائی بھی نمائش میں رکھنے کے قابل تھی ۔ ننگی پیٹھ اس پر اتنا لوٹے تھے کہ بان صاف اور چکنے ہو کر کالی اطلس ہو گیا تھا ۔ ادوان خود کھینچتے تھے اور ایسی کھینچتے تھے کہ ہاتھ مارو تو طبلے کی آواز دے ۔ خدا معلوم اب یہ چارپائی کس کے قبضے میں ہے ، کسی کے پاس بھی ہو سونے میں بڑا آرام دے گی ؟

فرحت کا شوخ اور شگفتہ اسلوب اور ان کی زبان ظرافت کی جان ہے ۔ ان کی ظرافت سنجیدہ ظرافت ہے ۔ ان کی وہ مزاحیہ تحریریں جو عظمت اللہ خان کے تبائے ہوئے خوش مذاقی یا لائٹ ہیومر کے معیار پر پوری اترتی ہیں ۔ ان میں ظرافت اور سنجیدگی کا فنکارانہ و ساحرانہ امتزاج نظر آتا ہے ۔ فرحت مشرقیت کے دلدادہ و شیدائی تھے ۔ وہ اکثر اپنے مضامین میں اپنے وقت کی مٹتی ہوئی تہذیب کو موضوع بناتے ہیں تاکہ اس تمدن کے نمونے ہمیشہ کے لئے زندہ ہو جائیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے مضامین میں ماضی کو زندہ کرنے میں کامیاب رہے ہیں ۔ چونکہ ان کا مقصد ماضی کو زندہ کرنا اور اپنی دل دجان سے عزیز تہذیبی اقدار کو محفوظ کرنا تھا ۔ اور یہ مقصد بڑا سنجیدہ ہونے کے باعث بڑی احتیاط کا مقتضی تھا اگر یہ احتیاط ملحوظ نہ رکھی جاتی اور فرحت اس قسم کے واقعات کو اپنی فطری شگفتگی اور ظرافت کی آمیزش کے ساتھ پیش نہ کرتے تو ان کی تاریخی نقالت قائم رہتی اور فرحت اپنے مقصد میں ناکام رہتے ۔ ان کی

خوش اسلوبی اور شگفتگی و خوش طبعی نے جہاں ان مضامین میں لطیف مزاح پیدا کیا ہے وہاں ایک ہمدردانہ نقطۂ نظر بھی اُبھرا ہے جو اس معاشرت اور اس کی اقدار سے فرحت کی محبت کو ظاہر کرتا ہے۔ ہمدردانہ نقطۂ نظر اور زندہ دلی و خوش طبعی ان کی ظرافت کے عناصر ہیں اور یہ عناصر اس طرح گھلے ہوئے ہیں کہ کسی جگہ بھی ہمیں علیحدہ نظر نہیں آتے۔ ہمدردانہ اندازِ نظر اِن کی تحریروں کا سب سے بڑا وصف ہے یہی وجہ ہے کہ جب وہ اپنی من موہنی تہذیب اور معاشرت کا ذکر کرتے ہیں تو اگر کہیں اس کے کچھ پہلو انہیں ناپسند بھی ہوں تب بھی ان کے اسلوب میں طنز کی کاٹ کا انداز پیدا نہیں ہوتا۔ اُنہیں مشرقی طور طریقے اور انداز اتنے پسند ہیں کہ اس کے ناپسندیدہ عناصر کا ذکر بھی وہ کرتے ہیں تو زیادہ سے زیادہ مضحک انداز میں۔ نفرت اور حقارت کی ہوا تک بھی ان کی تحریروں کو چھو نہیں گئی۔ ان کی اس قسم کی تحریروں میں جہاں وہ ذاتی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔ ہلکی ہلکی طنز کا احساس ضرور ہوتا ہے لیکن یہ خوش طبعی اور لطیف ظرافت میں اس طرح ڈھکی چھپی ہوئی ہے کہ اس میں تلخی نام کو بھی نہیں۔ "پرانی اور نئی تہذیب کی ٹکر" سے چند سطور ملاحظہ ہوں۔

"خیر تو ہم سب یہ سن کر کر نواب صاحب برآمد ہونے والے ہیں، کمرے سے باہر نکل آئے اور اس طرح لائن باندھ کر کھڑے ہوئے کہ یہ چھجہ ہمارے بالکل سامنے تھا۔ . . . . . ہر شخص کی نظر اس چھجے پر لگی ہوئی تھی کہ ایک ہی دفعہ چوب دار نے آواز دی "آداب بجالاؤ" اس آواز کے سنتے ہی سب تو ایک دفعہ ہی رکوع میں گئے مگر میں نے جھکنے سے پہلے ایک چلتی سی نظر نواب صاحب پر ڈال لی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ نواب صاحب چھجہ پر کھڑے ہیں۔ بالکل اس طرح کہ گویا فوٹو اُتروا رہے ہیں"

"جب یہ جماعت ختم ہوئی تو تحت اللفظ پڑھنے والوں کی باری آئی۔ کسی نے خوش قسمتی سے چار پانچ بند پڑھ لئے تو کمال کیا ورنہ دو ہی بندوں پر بند کر دئے گئے۔"

"میر صاحب کی باری آئی تو انہوں نے مرثیہ کو بجائے ابتدا سے پڑھنے کے، وسط سے شروع کیا اور پہلے ہی بند پر میدان میں اُتر آئے۔ مرثیہ واقعی اچھا تھا۔ سب لوگ نہایت عزت سے سُن رہے تھے۔ میر صاحب نے تلوار تول کر اُٹھائی۔ چاہتے تھے کہ ہاتھ ماریں کہ "بس" کا اشارہ ہُوا، اور میر صاحب تلوار علم کئے ہوئے ممبر سے نیچے تشریف لے آئے۔"

فرحت کے ادبی مزاح یا متین ظرافت کی خوبی یہ ہے کہ یہاں بقول عبدالقادر سروری "فرحت اللہ بیگ کی کامیابی کی بڑی ضامن ان کی دلکش زبان ہے۔ صاف ستھری اور بامحاورہ زبان لکھنے پر انہیں بڑی قدرت حاصل تھی۔ جس طرح وہ خیال اور اظہارِ خیال کے سانچوں کو بگاڑ کر مزاح پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے اسی طرح وہ زبان کو نہ تو خواہ مخواہ بناتے ہیں اور نہ بگاڑتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی تحریروں میں ایسی مضحک، رکیک اور مکروہ صورتیں نہیں پیدا ہونے پاتیں جو بازاری مذاق کی سطح پر آجائیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ مرزا صاحب کی زبان اکثر بول چال کی زبان اور صاف ستھری اور میٹھی زبان ہوتی ہے۔ بعض اوقات ان کے موضوع اتنے دلچسپ نہیں ہوتے۔ جتنی دلکش ان کی زبان اور ان کا اندازِ بیان ہوتا ہے۔"[۱]

فرحت کے اندازِ تحریر کے بارے میں محمود نظامی لکھتے ہیں۔

ان کی زبان میں ایک مخصوص چٹخارہ، ایک خاص چاشنی ہے جس کی وجہ سے ہمیں اس کے مطالعے سے وہ مسرت محسوس ہوتی ہے جو اعلیٰ پایۂ کی انشاء سے ہونی چاہئے۔ خود زبان کی چاشنی ایسی چیز ہے جس پر بعض اوقات ہلکے مزاح کا رنگ

---

[۱] مرزا فرحت اللہ بیگ کا مزاح - عبدالقادر سروری - از یادگارِ فرحت مرتبہ غلام یزدانی صفحہ ۱۱۵

غالب آجاتا ہے یہی وجہ ہے کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کی تحریروں میں اسی" بے ارادہ" ظرافت کی آمیزش نظر آنے لگتی ہے جو اس طرز میں خود بخود غیر شعوری طور پہ پیدا ہوجاتی ہے۔ فرحت کے "خوش طبعی" اور متین ظرافت کے حامل مضامین میں انہوں نے "لائٹ ہیومر" اعلیٰ معیار قائم کیا ہے۔ یہاں وہ قہقہے لگاتے ہوئے میدان ظرافت میں خم ٹھونک کر نہیں اُترتے بلکہ متین اور سنجیدہ شکل و صورت بنائے سامنے آتے ہیں۔ وہ خوش مذاقی کے خمیر سے تیار ہونے والے شگفتہ و شوخ اسلوب کے شہنشاہ ہیں۔ اور اسٹائل سے مزاح پیدا کرنے کے سلسلے میں "یادگار مشاعرہ" اور "نذیر احمد کی کہانی" والے مضامین ان کے شاہکار ہیں۔ صفحے کے صفحے پڑھتے چلے جائیے کہیں آپ کو صرف و نحو کی ترتیب کو بگاڑ کر، جملوں کی ساخت کو توڑ مروڑ کر، الفاظ و کردار کی صورتوں کو مسخ کر کے ظرافت پیدا کرنے کی مثال نہیں ملے گی۔ شاذ و نادر اگر کوئی ایسا موقع ہوگا بھی تو وہاں بھی ادبی لطف ضرور ہوگا۔ معیار سے گری ہوئی بات کہیں نظر نہیں آئے گی۔ یہ مضامین مہذب ہنسی کا مفہوم سمجھاتے ہیں کہ ہنسی کے یہ معنی نہیں کہ آدمی قہقہے کا بم ہی اڑائے کھل کھلا کر بندوقوں کی سی باڑہی داغ دے۔ بلکہ ہنسی ایک طرح کی بشاشت، ایک ذہنی کیفیت یا نفسی انبساط کا نام ہے کہ قارئین کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل جائے اور ایک آدھ دفعہ وہ پھول کی طرح کھل کھلا کر ہنس بھی دیں۔ نذیر احمد کی کہانی سے کچھ سطور ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ ہمارے عربی کے پروفیسر مولوی جمیل الرحمان صاحب تھے۔ بڑے اللہ والے لوگ تھے۔ عربی کا گھنٹہ بآسانی تصوف کی باتوں میں گذر جاتا تھا۔"

۲۔ آخر یہ تجویز پاس ہوئی کہ "خاک از تودہ کلاں بردار" کے مقولے پر عمل

لے ہمارے مزاح نگار۔ محمود نظامی۔ نیرنگِ خیال ستمبر ۱۹۳۹ء۔

کہ کے کسی زبردست مولوی کو گھیرنا چاہیئے"

۳- "ہم دونوں نے بھی جا کر شام ہی سے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ڈیرے ڈال دیئے۔ آٹھ بجے، نو بجے، دس بج گئے مولوی صاحب نہ آج نکلتے ہیں نہ کل۔ خدا خدا کرکے دروازے سے قندیل نکلتی ہوئی معلوم ہوئی۔ ہم دونوں بھی ہاتھ پاؤں جھٹک خوشامد کے فقرے کے فقرے سوچ کھڑے ہوگئے۔ ہم آخری سیڑھیوں پر کھڑے تھے اس لئے دروازے میں سے پہلے قندیل نکلتی ہوئی نظر آئی۔ اس کے بعد جس طرح سمندر کے کنارے سے جہاز آتا دکھائی دیتا ہے، اسی طرح پہلے مولوی صاحب کا عمامہ، اس کے بعد ان کا نورانی چہرہ، سرگیں آنکھیں سفید ریش مبارک، سفید جبہ اور سب سے آخر بانات کی سلیم شاہی جوتیاں نظر آئیں"

۴- میں نے بھی سوچ لیا کہ آج اس بار یا اُس پار، مولوی ضیاالدین صاحب تو بچ کر نکل گئے۔ مولوی نذیر احمد صاحب سے دو دو ہاتھ ہو جائیں گے" مولوی نذیر احمد کی حلیہ نگاری ملاحظہ ہو۔

۵- سر بہت بڑا تھا مگر بڑی حد تک اس کی صفائی کا انتظام قدرت نے اپنے اختیار میں رکھا تھا جو تھوڑے رہے سہے بال تھے۔ وہ اکثر نہایت احتیاط سے صاف کرا دئے جاتے تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ داڑھی بہت چھدری تھی۔ ایک ایک بال بآسانی گنا جا سکتا تھا کٹے تو کبھی قینچی کے منت کش نہ ہوئے۔ البتہ ٹھوڑی پر کا حصہ کبھی کبھی ہموار کر لیا جاتا تھا۔ داڑھی کی وضع قدرت نے خود فرنچ فیشن بنادی تھی۔ بالوں میں سے ٹھوڑی اس طرح دکھائی دیتی تھی جس طرح اکس ریز (X-RAYS) ڈالنے سے کسی بکس کی اندر کی چیز"

۶- "ہاں تو میں کیا تصویر دکھانا چاہتا تھا؟ مولوی صاحب کا لباس، مگر

خدا کے فضل سے اُن کے جسم پر کوئی لباس ہی نہیں ہے جس کا تذکرہ کیا جائے ...... ایک چھوٹی سی تہمد بر لئے نام کمر سے بندھی ہوئی ہے۔ بندھی ہوئی نہیں محض لپٹی ہوئی ہے۔ لیکن گرہ کے جنجال سے بے نیاز ہے" ــــــ آیئے اب لگے ہاتھوں مولوی صاحب کے کھانے پینے کے بارے میں بھی کچھ جان لیں۔

۷ ۔ "خوش خوراک تھے اور مزے لے لے کے کھانا کھاتے تھے۔ ناشتہ میں دو نیم برشت انڈے ضرور ہوتے تھے۔ میوہ کا بڑا شوق تھا، ناشتے اور کھانے کے ساتھ میوہ کا ہونا لازم تھا۔ پڑھاتے جاتے تھے اور کھاتے جاتے تھے۔ مگر مجھ کو ایک حسرت رہ گئی کہ کبھی شریکِ طعام نہ ہوسکا...... کہتے بھی جاتے تھے "بھئی کیا مزے کا خربوزہ ہے میاں کیا مزے کا آم ہے" مگر بندۂ خدا کبھی یہ نہ کہا کہ بیٹا ذرا چکھ کر تو دیکھو یہ کیسا ہے۔ میں نے تو تہیہ کر لیا تھا (میاں دانی اب انکار کریں تو کریں، لیکن ان کا بھی یہی ارادہ تھا) کہ مولوی صاحب اگر جھوٹے منہ بھی شریک ہونے کا کہیں تو ہم سچ مچ شریک ہو جائیں"۔

ہم نے گذشتہ سطور میں فرحت کی مزاح نگاری کا جائزہ لینے سے قبل یہ کہا تھا کہ ان کی مزاحیہ تحریروں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے نمبر پر اُن کے وہ مضامین ہیں جن میں خوش طبعی یا ادبی مزاح کے عناصر بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں ہم یہ دیکھ آئے ہیں کہ ان کی یہ مزاحیہ تحریریں ان کے اسٹائل یا اسلوب سے خون حاصل کرتی ہیں۔ اس پہلی قسم کی ظرافت کی بنیاد افراد اور کرداروں کے تعارف اور ان کے تفصیلی مطالعے پر رکھی گئی ہے۔ فرحت کا کمال یہ ہے کہ وہ ان افراد کو اس طرح دکھاتے ہیں کہ وہ جو بھی ان کے متعلق بتاتے ہیں وہ بطور کردار محسوس ہمارے سامنے آتا ہے۔ ایک کٹھ پتلی کی طرح اپنے نچانے والے کے اشاروں پر حرکت نہیں کرتا۔ وہ اپنے کرداروں کو پیش کرتے وقت شگفتگی اور ظرافت پیدا

کرنے کے لئے ان کی شکلیں مسخ نہیں کرتے نہ ہی انہیں ایسے پس منظر میں سامنے لاتے ہیں کہ وہ بے ڈھنگے سے ہوکر قارئین کو ہنسایئں۔ بلکہ ان کا مزاح ان کے اسلوب اور اُن کی زبان سے زندگی حاصل کرتا ہے۔ ان کی زبان کی شوخی اور مزاح کا تجزیہ کرنا بڑا مشکل ہے۔ اُن کی یہ خصوصیت اُن کی ذاتی زندہ دلی کا کرشمہ ہے جو اُن کی تحریروں میں پُر اسرار طریقے سے رچی ہوئی ہے۔ لہٰذا ان عناصر کا سراغ لگانا جو اُن کی مزاحیہ زبان و بیان کا حصہ ہیں۔ بڑا دشوار کام ہے۔ یہ اُن کے جملوں کی ساخت، لفظوں کا موقع و محل پر استعمال اور ان کی طبعی شوخی اور ظرافت کا ملا جُلا کمال ہے کہ آپ پڑھتے جاتے ہیں لیکن کہیں مبالغے کا احساس بھی نہیں ہوتا اور آپ کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے۔ نذیر احمد کی کہانی سے چند جملے ملاحظہ ہوں۔

۱۔ سر بہت بڑا تھا۔ مگر بڑی حد تک اس کی صفائی کا انتظام قدرت نے اپنے اختیار میں رکھا تھا۔"

۲۔ پہلو میں حقہ، اس کی حقیقت! کما حقہٗ بیان کرنا مشکل ہے۔

۳۔" ذرا دن چڑھا، اِدھر مولویوں کی جماعت اور خود مولوی صاحب کا ناشتہ داخل ہُوا۔"

ایک جملہ" ایک وصیت کی تعمیل" سے بھی ملاحظہ ہو۔

۴۔ چائے بن رہی ہے، خود پی رہے ہیں، دو سردں کو پلا رہے ہیں۔ ایک نمک کا ڈلا پاس رکھا ہے۔ چائے بنائی نمک کے ڈلے کو ڈال، دو ایک چکر دے نکال لیا۔

۵۔" دیکھا کہ دروازے میں یہ بڑا قفل لٹک رہا ہے۔ سمجھ گیا کہ مولوی صاحب کہیں چُرنے چُگنے تشریف لے گئے۔"

مندرجہ بالا فقروں کے خط کشیدہ الفاظ کا اپنے اپنے موقع پر استعمال اس

شگفتگی سے ہوا ہے کہ جملہ پڑھتے ہی دل میں گدگدی ہوتی ہے۔ اور ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلنے لگتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے ظرافت کا سبب محض لفظوں کا اس قسم کا استعمال ہی ہے جس میں ایک حد تک رعایت لفظی کو بھی دخل ہے۔ بلکہ اگر ذرا غور کریں تو ہمیں پورے جملے مزاح کے ہلکے رنگ میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ظرافت ان میں اس طرح سرایت کئے ہوئے ہیں کہ ہم ان عناصر کی نشاندہی کرنے یا ان عوامل کا تجزیہ کرنے سے قاصر ہیں۔

فرحت اظہار اور زبان پر مکمل قدرت رکھتے ہیں۔ اپنے اسلوب سے شگفتگی اور مزاح پیدا کرنے کے لئے وہ مختلف گُر استعمال کرتے ہیں۔ لفظوں کی تقدیم و تاخیر اور جملوں کی مخصوص بناوٹ میں وہ خوش طبعی کو اس طرح سمو دیتے ہیں کہ کہیں تکلف یا آورد کا احساس نہیں ہوتا اور ہر جگہ بے ساختگی اور آمد کے چشمے ابلتے دکھائی دیتے ہیں۔ مرزا فرحت بعض موقعوں پر کچھ اس قسم کے نئے لفظ بھی وضع کرتے ہیں کہ جہاں وہ بیان کئے جانے والے واقعے میں زندگی کی روح دوڑا دیتے ہیں وہاں ظرافت کی فضا پیدا کرنے میں بھی بڑی مدد دیتے ہیں مثلاً۔

"مولوی صاحب نے کئی مرتبہ اس عاجزی پر بھی رفتی حملے کئے لیکن یہ ذرا ٹیڑھا مقابلہ تھا" اس فقرے میں لفظ "عاجز" اور "رفتی حملے" نے جو لطف پیدا کیا ہے یہ فرحت ہی کے اسلوب کا حصہ ہے۔

اس پہلی قسم کی ظرافت والے مضامین (مثلاً ایک وصیت کی تعمیل — آخری یادگار مشاعرہ — نذیر احمد کی کہانی) کا تجزیہ کیا جائے تو فرحت کے مزاحیہ اسلوب کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ان مضامین میں ہمیں نذیر احمد، سلیم اور دیگر مشاہیر اہل قلم کی زندہ اور جیتی جاگتی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ ان مرنے والے حضرات کو پھر سے زندہ کر دکھانے میں جہاں فرحت کی

فطری صلاحیتیں اور مزاحیہ اسلوب اور قوتِ مشاہدہ کو اہمیت حاصل ہے۔ وہاں کچھ اور امور بھی قابلِ ذکر ہیں۔ اس سلسلے میں عزیز احمد صاحب نے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ:۔

"نذیر احمد کی کہانی" میں فرحت کی فنکاری کے کچھ اور پہلو

"عام طور پر مشرق کا قاعدہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد مرنے والے کی تمام کمزوریاں بھلا دی جاتی ہیں۔ صرف اس کی اچھائیاں یاد رکھی جاتی ہیں یہ عفو اور درگزر بلاشبہ نہ صرف اخلاقی بلکہ سماجی نقطۂ نظر سے بھی جائز اور مفید ہے مشاہیر کے احسانات یا ان کی خدمتیں یاد رہ جاتی ہیں لیکن اس میں ایک نقصان بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ مرنے والے کی جیتی جاگتی تصویر نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے اور اس کی چند خصوصیات اور چند احسانات کی یاد رہ جاتی ہے۔ میرزا فرحت اللہ بیگ نے نہ صرف مرنے والوں کی کمزوریوں کو یاد رکھا بلکہ ان کا ذکر بڑی محبت سے کیا۔ اردو کے جن مشاہیر کو وہ جتنا جانتے تھے ان کا اتنا ہی ذکر انہوں نے کیا اور اس میں کچھ نہیں چھپایا اور نہ رعایت سے کام لیا اور اس طرح مرنے والوں کی جیتی پھرتی تصویریں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دی ہیں۔"

فرحت کی سوانح نگاری یا سوانحی خاکہ نگاری یا مرقع نگاری (یا جو نام بھی مناسب ہے) میں ہر جگہ ان کا طریقِ کار مختلف افراد کی تصویر کشی میں وہی ہے جس کا مختصراً اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ مغرب میں اس قسم کی سوانح نگاری کوئی نئی چیز نہیں ہے لیکن اردو کے سوانحی ادب میں یہ انداز نیا ضرور تھا اور شاید اب بھی

۵ے میرزا فرحت اللہ بیگ کا مزاحیہ اسلوب۔ مضمون۔ عزیز احمد۔ یادگارِ فرحت ص۲۰۱۔

ہے۔ فرحت ایسے کرداروں کا انتخاب کرتے ہیں، جن سے انہیں بڑی محبت ہوتی ہے۔ وہ اپنے مضامین کے موضوع بننے والی شخصیتوں سے سچی محبت اور سچا خلوص رکھتے تھے۔ اور یہ خلوص ایسا تھا کہ وہ اپنے اِن پسندیدہ افراد کے گرد کسی قسم کے جھوٹ، چاپلوسی یا "مدلل مداحی" کا ہالہ برداشت نہیں کر سکتے تھے وہ جن لوگوں کو پسند کرتے تھے انہیں بحیثیت انسان پسند کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ انہیں ان کی کمزوریاں بھی بری نہیں لگتی تھیں۔ اور جب وہ ان کمزوریوں کا ذکر کرتے ہیں تو ایک محبت آمیز شوخی کے ساتھ جس میں طنز یا نفرت کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ وہ اپنے محبوب افراد کو انسانوں کے روپ میں پیش کرتے ہیں، فرشتہ یا شیطان بنا کر نہیں دکھاتے۔ یہی وجہ ہے اِن افراد کی زندہ تصویریں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ اور اُن کی یاد ہمیشہ ہمارے دل میں رہتی ہے۔

فرحت بڑے کمال کے آدمی تھے۔ ان کی شخصیت میں ہمیں مشرق و مغرب کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ وہ انگریزی پڑھے ہوئے مشرقی و مغربی ادب سے گہری واقفیت رکھنے والے ایسے سلجھے ہوئے شخص تھے کہ جہاں ایک طرف انہیں مشرقی تہذیب و معاشرت کی اقدار سے عشق تھا وہاں دوسری طرف ان کے ادبی شعور نے مشرقی طور طریقوں کو پسند کرنے کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب سے بھی گہرا مثبت اثر قبول کیا تھا۔ ان کے سوانح قسم کے مضامین میں ان کی فکر کے اس حسین امتزاج کی بڑی خوبصورت جھلکیاں دکھائی دیتی ہے۔ انہوں نے اپنے بے باک شوخ اور پُر مزاح اسلوب میں مغرب کے سوانحی اصولوں کے پیش نظر مشرق کی صحیح نمائندگی کرنے والی شخصیتوں کو اس فنکارانہ طریقے سے پیش کیا ہے کہ باید و شاید۔ فرحت کی نگاہ دور رس اور عقل رسا تھی وہ بلا کے ذہین اور پختہ شعور کے مالک تھے۔ مغرب سے زندگی کی حرکت و توانائی مستعار لے کر مشرق

کی رگوں میں گرم خون دوڑانے کا فن کوئی ان سے سیکھے۔ ورنہ عزیزوں کے علاّوں کی عظمت اور کشادگی دیکھ کر اپنی چھوٹی بیاں تو آج بھی اکثر کم فہم ڈھارہے ہیں اور اسی میں اپنی بڑائی سمجھتے ہیں۔

اس قسم کے مضامین میں جن کا ذکر گذشتہ سطروں میں ہوا، نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ اپنی زبانی "فرحت کا شاہکار ہے اور اردو زبان وادب کا مایۂ ناز سرمایہ۔ اس سلسلے میں "ایک وصیت کی تعمیل" بھی کم نہیں لیکن اس کا کینوس، اوّل الذکر سے محدود ہے۔ گو اوّل الذکر بھی اتنا مفصل نہیں کہ اسے ایک مکمل سوانح نگاری کہا جا سکے۔ لیکن اس میں پھر بھی موضوع تحریر شخصیت کے کافی پہلو نگاہوں کے سامنے آتے ہیں۔ انداز دونوں کا ایک سا ہے لیکن "نذیر احمد کی کہانی" میں فرحت کا فن اور اسلوب ایک نسبتاً کھلے میدان میں خصوصاً نمایاں اور واضح ہو کر سامنے آیا ہے۔ الطاف فاطمہ، سوانحی نظر سے اس مضمون کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتی ہیں:

"مصنف کا بحیثیت شاگرد صاحب سوانح سے جو تعلق تھا اور اس حیثیت سے انہوں نے صاحب سوانح کی شخصیت کا جو مطالعہ کیا اس کے علاوہ بھی انہوں نے اس کہانی میں ان کی زندگی کے چند اور نمایاں واقعات کا ذکر باتوں باتوں میں بڑی خوبی سے کر دیا ہے۔ بلکہ خود صاحب سوانح کی زبانی بیان کرا دیا ہے مثلاً مولانا کی تعلیمی زندگی اور مشکلات، دہلی کالج میں داخلہ، اسی طرح مراۃ العروس اور چند پند کا اتفاقیہ منظر عام پر آنا، ایل۔ ایل۔ ڈی کی ڈگری کا ملنا۔ محسن الملک سے ان کے خوشگوار اور پھر کشیدہ تعلقات پر روشنی ڈالی ہے اور لطف یہ ہے کہ انہیں بیان اس طرح کیا ہے کہ بات میں سے بات نکلتی چلی آتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ نذیر احمد کے

اس شوخ شاگرد کے قلم نے ان کا جیتا جاگتا، سچا، مکمل اور زندہ خاکہ پیش کیا ہے وہ مولوی افتخار عالم کی مبسوط اور جامع کتاب بھی نہ پیش کر سکی۔[۵]

فرحت چونکہ نذیر احمد کی مکمل سوانح عمری لکھنے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے اس لئے انہوں نے اپنے موضوع کے بارے ان بے شمار معلومات میں سے جو ان کی دسترس میں تھیں، نہایت کاری گری سے وہی مواد استعمال کیا جو ان کے مشاہدے میں آچکا تھا۔ اگر نذیر احمد پر اس قسم کا مضمون کوئی دوسرا شخص لکھتا تو شاید انصاف نہ کر سکتا۔ اس شگفتہ و شوخ شخصیت کے لئے فرحت کا سا شوخ و شریر اسلوب ہی موزوں تھا۔ انیسویں صدی میں جبکہ تنقید و تبصرہ کی بے باکی اور حقیقت بینی کی بجائے تحسین و تقریظ کو پسندیدہ سمجھا جاتا تھا۔ فرحت نے اپنے لئے نیا راستہ نکالا۔ ان کے سامنے اُردو سوانح نگاری کے مشہور نمونے موجود تھے۔ لیکن وہ صرف "حالاتِ زندگی" نہیں لکھ رہے تھے بلکہ ان کا مقصد ایک زندہ شخصیت کی زندہ تصویر کشی تھا۔ لہٰذا انہوں نے قدیم مشرقی طریقوں کو بالائے طاق رکھا اور وہی لکھا جو سچ تھا۔ انہوں نے اس مختصر سے مضمون میں حقیقت اور جزئیات نگاری کا پورا پورا التزام رکھا۔ لیکن چونکہ یہ کام نیا تھا اور راستہ اجنبی اسلئے پہلے پہلے وہ ڈرتے بھی رہے "بہت کچھ لکھ لیا تھا وہ پھاڑ ڈالا کہیں اینچن کھینچن بن نہ پڑ جاؤں۔ رہ رہ کر جوش آتا تھا اور ٹھنڈا پڑ جاتا تھا" لیکن ان کی فطری بے باکی اور مولوی عبدالحق کی ہمت افزائی نے ساتھ دیا اور انھوں نے طے کر لیا کہ:۔

"اب جو کچھ کانوں سے سُنا اور آنکھوں سے دیکھا وہ لکھوں گا۔ اور

---

۵ اردو ادب میں فنِ سوانح نگاری کا ارتقاء ——— الطاف فاطمہ۔

بے دھڑک لکھوں گا۔ چاہے کوئی بُرا مانے۔ جہاں مروی صاحب کی خوبیاں دکھاؤں گا وہاں ان کی کمزوریوں کو بھی ظاہر کردوں گا تاکہ اس مرحوم کی اصلی اور جیتی جاگتی تصویر کھینچ جائے اور یہ چند صفحات ایسی سوانح عمری نہ بن جائیں جو کسی کو خوش کرنے یا جلانے کو لکھی گئی ہو؟"

اس میں کچھ شک نہیں کہ تمہید میں انہوں نے اپنے ساتھ جو وعدہ کیا وہ حرف بحرف پورا کیا۔ اور ایک محدود کینوس پر ایک ایسی سوانح عمری لکھی جس میں ایک اعلیٰ درجے کی سوانح نگاری کے تمام اوصاف موجود ہیں۔ عموماً سوانح نگاری میں موضوع کی زندگی کے ساتھ اُس کے عہد کا جائزہ بھی لیا جاتا ہے جو موضوع کو ابھارنے میں پس منظر کا کام دیتا ہے لیکن بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اسی پس منظر کا بیان اتنا طویل ہوجاتا ہے کہ موضوع نمایاں ہونے کی بجائے دب کر رہ جاتا ہے۔ لیکن "نذیر احمد کی کہانی" میں عصری جائزہ موضوع کے عمل اور ردِعمل کے امتزاج سے لیا گیا ہے اور موضوع اور اس کے عہد کو اس طرح ملا جلا کر پیش کیا گیا ہے کہ موضوع کی تصویر اپنے عہد کے پس منظر میں۔

بڑی خوبصورتی کے ساتھ، نمایاں ہو جاتی ہے۔ عہد اور موضوع میں توازن کی یہ ایک عمدہ مثال ہے۔

اسلوب، فن اور سوانحی اصول غرض ہر لحاظ سے فرحت کا یہ مضمون اُردو ادب کے لئے ایک تحفہ ہے اور کسی محبوب و محترم ہستی کو ظرافت اور مزاح کے رنگ میں اس کی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ دکھانے کا بہترین نمونہ بھی۔

"دہلی کا ایک یادگار آخری مشاعرہ" بھی ایک لحاظ سے "نذیر احمد کی کہانی" اور "ایک وصیت کی تعمیل" قسم کا ہی مضمون ہے۔ کیونکہ اس میں بھی اوّل الذکر مضامین کی طرح چند افراد کی عادات و اطوار

یادگار مشاعرہ

کا مختصر بیان ہے اور جہاں ان کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں وہاں ان کی خامیوں کی طرف بھی اشارے کئے ہیں۔ لیکن اس میں کچھ باتیں ایسی بھی ہیں جو اسے متذکرہ تحریروں سے الگ قسم کی چیز بناتی ہیں۔ پہلے دو مضامین میں ایک ایک شخصیت کو لے کر سوانحی انداز سے ان کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے لیکن "یادگار مشاعرہ" میں چہروں کا ہجوم ہے۔ تقریباً ۶۵ افراد مختلف طبیعتوں اور عادتوں کے یہاں جمع ہیں ماقبل الذکر مضامین میں نذیر احمد اور مولانا سلیم جیتے جاگتے کردار بن کر نگاہوں کے سامنے آتے ہیں سان کے بارے میں فرحت کے بیانات ہیں نسبتاً تفصیل ہے۔ اور یہ اشخاص نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں۔ لیکن "یادگار مشاعرہ" میں کردار نگاری کا رنگ بہت دھیما اور ہلکا ہے۔ اس مختصر مضمون میں اتنے سارے لوگوں کی شخصیت نگاری کا کام ہو بھی نہیں سکتا تھا اور نہ ہی یہ فرحت کا مقصد تھا۔ کردار نگاری کسی فرد کے ظاہری اور باطنی پہلو نمایاں کرنے کا نام ہے لیکن وہ تو محض پرانی وضع قطع کے لوگوں کے لباس، چال ڈھال اور اوضاع و اطوار کو سامنے لانا چاہتے تھے تاکہ" آنے والی نسلیں اردو کے ان محسنوں کی شکلیں (خواہ وہ دھندلی ہی کیوں نہ سہی) دیکھ سکیں" اور ان کا کلام پڑھتے وقت ان کی شکل و صورت، حرکات و سکنات، آواز کی کیفیت، نشست و برخاست کے طریقے، طبیعت کا رنگ اور سب سے زیادہ یہ کہ اُس کے لباس، اور وضع قطع کا خیال دل میں رہے"

"یادگار مشاعرہ" کی مقبولیت اور اہمیت بیک وقت کئی اسباب کی بناء پر ہے۔ اسے بعض ایک ایسا مضمون قرار دیتے ہیں جس میں گذشتہ ادبی روائیتوں، طور طریقوں، آداب معاشرت اور لباس و تہذیبی لوازمات کے رنگ جمع ہیں۔ اس کے مطالعہ سے تفریح طبع کے ساتھ ساتھ ماضی کی بھی یاد تازہ

ہوجاتی ہے گو یہ تاریخی مضمون نہیں لیکن اس میں جو تاریخیت پائی جاتی ہے۔ اور ایک خاص عہد کی سماجی، معاشرتی اور تہذیبی معلومات جس حسن و خوبی کے ساتھ جمع کی گئی ہیں۔ اس کی صحت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مشاعرے کے انتظامات شعرا کو مدعو کرنے کے سلسلے کی دشواریاں، مصرع طرح پر بدلطفی پیدا ہونے کا امکان، بادشاہ وقت کی غزل کا مشاعرہ میں پڑھا جانا۔ مشاعرے میں نشست و برخاست کے آداب، لوگوں کا لباس، ان کی وضع قطع، گفتگو کا انداز، شاعروں کے چونچلے، ان کی نازبرداریاں، ان کی جلی کٹی باتیں، اساتذہ کی گروہ بندیاں، شاگردوں کی رقابت، ان کے آپس کے تعلقات، وضع داریاں یہ تمام جزئیات مصنف نے بڑی کاری گری کے ساتھ اس طرح پیش کی ہیں کہ اس زمانے کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

"یادگار مشاعرہ" میں مضمون اور ڈرامے کا ملا جلا انداز پایا جاتا ہے۔ یہ مضمون اس طرز کا ہے کہ اسے آسانی کے ساتھ اسٹیج کیا جا سکتا ہے اور اسے سب سے پہلے اورنگ آباد میں کالج ڈے کے موقع پر اسٹیج بھی کیا گیا تھا۔ فرحت نے اس سلسلے میں اسٹیج ڈائریکٹر کے فرائض انجام دئے تھے۔ اور اسے اس خوبی سے عوام کے سامنے پیش کیا تھا کہ اصل اور نقل میں کوئی تمیز نہیں کر سکتا تھا۔ اس موقع پر اسٹیج پر مشاعرہ منعقد ہونے پر اداکار شاعروں کی جو تصویر لی گئی تھی اسے مہاراجہ کشن پرشاد دیکھ کر دھوکا کھا گئے اور سمجھے کہ شاید یہ تصویر کسی حقیقی مشاعرے کی ہے جس میں مومن، غالب، ذوق وغیرہ بذات خود موجود تھے۔ جب فرحت نے ان پر حقیقت حال کی وضاحت کی کہ یہ اصلی بزرگ نہیں بلکہ نقلی ڈاڑھیاں لگا کر بیٹھنے والے "بہروپیے" ہیں تو وہ بہت مسکرائے۔ ورنہ مہاراجہ کی آنکھوں میں تصویر دیکھ کر ماضی کے لوگوں کو پہچان کر آنسو آگئے تھے ——— یہ

مضمون تین حصص میں منقسم ہے۔

۱۔ تدبیر:۔ اس حصّے میں بیانیہ انداز سے مشاعرے کے انعقاد کے لئے کریم الدین کی بھاگ دوڑ کا ذکر ہے۔

۲۔ ترتیب:۔ یہ بھی بیانیہ حصّہ ہے جس میں مشاعرہ کے انتظامات اور شعرا کے آنے کا ذکر ہے۔ لیکن یہاں بیانیہ رنگ ڈرامے کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور ڈرامائی انداز سے شعرا سامنے آتے ہیں اور اپنی اپنی حیثیت اور مرتبے کے مطابق بٹھائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد "تکمیل" میں باقاعدہ مشاعرہ شروع ہو جاتا ہے۔

بعض حضرات نے اس مضمون کو فرحت کی تنقیدی خوش مذاقی کا نمونہ قرار دیا ہے بقول ڈاکٹر سید عبداللہ "تنقیدی خوش مذاقی سے مراد یہ ہے۔ کہ مختلف شعرا کو اس مشاعرے میں بُلا کر ان کی زبان سے نہ صرف اُن کی بہترین غزلوں کو پیش کیا گیا ہے۔ بلکہ (DESCRIPTION) کے ہمراہ ان ادب پاروں پر ایک تنقیدی نظر بھی ڈالی ہے جس کو پڑھ کر اِن شاعروں کا الگ الگ مقام ہماری نظر میں متعین ہو جاتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گر فرحت نے یہ سب کچھ تنقید کے انداز میں پیش نہیں کیا بلکہ اس رائے کو شاعروں کے ایک دوسرے کے داد دینے میں پیش کیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فرحت نے ۔ ۔ ۔ تنقید کو اتنی خوش مذاقی اور شگفتگی کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کیا ہے کہ تنقید بھی ہے اور ہماری تفریح کا سامان بھی"

" یادگار مشاعرے" سے جہاں ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غالب اور ذوق کے زمانے میں شاعری کی تنقید کا انداز کیا تھا۔ کس طرح شاعر ایک دوسرے کے کلام کے حسن و قبح پر اظہارِ خیال کرتے تھے۔ وہاں ہمیں محض اسی مضمون

کے سہارے فرحت کے تنقیدی شعور سے بھی کچھ واقفیت ہوجاتی ہے۔
یادگار مشاعرے میں خوش مذاقی، تنقید، ڈراما، کہانی، مرقع نگاری اور تاریخ نویسی کے عناصر گھلے ملے ہوئے ہیں۔ فرحت کو مومن کی تصویر دیکھ کر اس قسم کا مضمون لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ انہوں نے بزرگوں کے مرقع بنانے اور لفظوں کے ذریعے ان کی جیتی جاگتی تصویریں کھینچنے کے لئے "آب حیات" اور "نیرنگِ خیال" سے بھی استفادہ کیا۔۔ مختلف اجزاء کو اس مضمون میں بڑی خوبصورتی سے ترتیب دے کر مصنف نے کمالِ فنکاری کا ثبوت دیا ہے۔ مضمون کی ساخت اور تعمیر میں فرحت کی کاری گری کے جوہر بڑی عمدگی سے نمایاں ہوئے ہیں — یہ مشاعرہ کہیں سچ مچ منعقد نہیں ہوا تھا۔ اس کی حقیقت ایک افسانے کی سی ہے۔ لیکن اس میں مختلف کڑیوں کو اس طرح جوڑا گیا ہے کہ اس عہد کی مجلسی زندگی کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔
فرحت موقلم اور رنگوں سے بڑی خوبصورت تصویریں بناتے تھے۔ اور مصوری میں دہلی کے ایک مشہور استاد کے شاگرد بھی تھے۔ لیکن انہوں نے "نذیر احمد کی کہانی" اور "یادگار مشاعرہ" میں لفظوں سے جو فوٹو اتارے ہیں وہ ان کی تصویرکشی کا بہت اعلیٰ اور منفرد نمونہ ہیں۔ انہوں نے ان مرقعوں میں جزئیات کے بیان اور اسلوب کی رنگ آمیزی سے جو حسن پیدا کیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے یہی وجہ ہے کہ اتنے سارے حلیے ایک جگہ جمع ہوجانے سے "یادگار مشاعرہ" فوج کے چہروں کا رجسٹر بن کر بے لطف نہیں ہوگیا۔ انہوں نے جس باریک بینی اور توجہ سے شخصیتوں کے خارجی نقوش اجاگر کئے ہیں۔ ان کے لباس، طریقۂ نشست و برخاست کا ذکر کیا ہے۔ اس نے ہمارے سامنے ان مشاہیر کی چلتی پھرتی تصویریں لاکھڑی کی ہیں —————— غرض یہ کہ "یادگار مشاعرہ"

کا جس اعتبار سے بھی جائزہ لیں۔ یہ ایک اعلیٰ درجے کی تصنیف ہے۔ مضمون، کہانی، ڈرامائی عناصر، مرقع کشی، حقیقت نگاری اور خوش مذاقی یا ظرافت ہر لحاظ سے "یادگار مشاعرہ" ایک پُر لطف اور مفید مضمون ہے۔ فرحت نے مزاح کو خواہ مخواہ مضمون میں داخل نہیں کیا بلکہ وہ موقع کی مناسبت سے خود بخود ان کے اسلوب بیان میں گھل مل کر ظاہر ہوتا ہے۔

مشاعرے میں سنجیدہ شعراء کے ساتھ ساتھ ہنسوڑ شاعر بھی شامل ہیں جن کے ظریفانہ رنگ طبیعت سے مزاح خود بخود جنم لیتا ہے۔ یادگار مشاعرے میں جو مزاح ہے اسے مزاح یا ظرافت کی بجائے لائٹ ہیومر، خوش طبعی یا شگفتگی کا نام ہی دیا جائے تو بہتر ہے۔ کیونکہ اس میں ایسا موقع کوئی نہیں کہ قارئین کھل کر ہنسیں۔ البتہ ایسے مقامات بہت ہیں جب لبوں پہ خود بخود تبسم کی کلیاں کھلنے لگتی ہیں۔ اس سلسلے میں مرزا علی بیگ نازنین کے مشاعرہ میں کلام پڑھنے کا بیان ملاحظہ ہو۔ میر صاحب کے اندازِ شعر گوئی کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ بھی دلچسپ چیز ہے۔ ان دو شاعروں پہ ہی کیا موقوف ہے بار ہا مضمون میں ایسے پر لطف بیانیہ ٹکڑے اور ڈرامائی اجزا آتے ہیں کہ پڑھنے والا گدگدی سی محسوس کرتا ہے اور طبیعت شبنم میں نہائے ہوئے پھول کی سی شگفتگی اور تازگی کا مزا لیتی ہے۔

فرحت کی مزاح نگاری کا دوسرا انداز وہ ہے جہاں وہ صورت، واقعہ، کرداروں کی ناہمواریوں اور بے ڈھنگی حرکات سے ظرافت پیدا کرتے ہیں۔ مسکراہٹوں کے پھول بکھیرنے کے لئے زبان و بیان کی چاشنی اور خوش طبعی یا خوش مذاقی کے انداز کی جھلکیاں ان مضامین میں بھی نظر آتی ہیں۔ لیکن یہ مضامین قہقہہ آور

زیادہ ہیں۔ اور ہنسانے کے لئے یہاں ظرافت واقعہ نگاری، بے ڈھنگی اور ناہموار صورتِ حال سے پیدا کی گئی ہے۔ اس قسم کے مضامین میں "پرانی اور نئی تہذیب کی ٹکر" "مردہ بدست زندہ" "غلام" "ایک نواب صاحب کی ڈائری" "عشق کی کی گو بیاں" "تھا صاحب بہادر" "عالم بے کسی دبے کسی" وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے چند سطور ملاحظہ ہوں۔

۱۔ "یہ غلط انداز نظر ڈالنے کے بعد میں بھی تسلیم کو جُھکا۔ ہماری اصطلاح میں سلام کرنا محض ماتھے کے سامنے ہاتھ لے جانے کو کہتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ یہ بڑے آدمی ہیں۔ فوراً جھک کر اس فرض کو ادا کر دو۔ جُھکا، سلام کیا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ لیکن اِدھر اُدھر جو دیکھتا ہوں تو سب لوگ جُھکے ہوئے زنا زن ہاتھ چلا رہے ہیں" "نقل راچہ عقل" میں نے بجی غضب رکوع میں جا پٹ پٹ ہاتھ چلانے شروع کر دئے مگر کن انکھیوں سے دو مردوں کو دیکھتا رہا۔ جب دیکھا کہ اب سب سیدھے ہو گئے تو میں نے بھی سیدھے کھڑے ہو کر نیت کی طرح ہاتھ باندھ لئے۔

۲۔ ہمارے تقرڈ ماسٹر صاحب بڑے تنگڑے تھے۔ کشتی بھی جانتے تھے۔ ان کا مقابلہ ایک بڑی لمبی داڑھی والے ماسٹر سے ہو گیا۔ خیر انہوں نے بچارے کو پٹخنے دئے سو دئے، اس لپاڈگی میں اس کی آدھی داڑھی بھی نوچ لائے اور یہ داڑھی مالِ غنیمت کا ایک جزو قرار پائی"

۳۔ "ہمرائے میں جا کر ایسی لمبی تانی کو نو بجا دئے۔ اُٹھا تو بیت‌الخلاء کی تلاش ہوئی۔ لوگوں سے پوچھا۔ انہوں نے ایک طرف اشارہ کر دیا۔ ادھر گیا، کیا دیکھتا ہوں کہ کونے میں ایک الماری کھڑی ہے۔ لیکن نظر نہیں آتا کہ بیت‌الخلاء کہاں ہے۔ لوگوں سے پھر جا کر پوچھا۔ تو معلوم ہوا کہ جس کو میں الماری سمجھا تھا وہی ان بھلے مانسوں کا بیت‌الخلاء ہے۔ اب میری جسامت کو دیکھو (یہ صاحب سات فٹ کے عباری بھرکم۔

جن نما ان (جیسے) راستہ ہوتی تو اِدھر اُدھر بادشاہی پودے لگا دیتا۔ دن اور رات بیتتی نہ تھی۔ کروں تو کیا کروں جب بے تابی حد کو پہنچ گئی تو اس الماری کا پٹ کھولا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کھونٹے سے قدمچہ کے گرد آڑ کے لئے چیڑ کے تختے جڑے ہوئے ہیں۔ اب اگر سیدھا اندر چلا جاتا ہوں تو اندر جا کر مڑوں گا کیونکر۔ آخر یہ ترکیب سوجھی کہ الٹے پاؤں اندر دھنس جاؤں زور کر کرا کے، اندر پہنچ ہی گیا۔ لوٹا رکھنے کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔۔۔ تو خدا بھلا کرے میری توند کا، اس کے سہارے سے یہ مشکل بھی آسان ہوئی۔ خدا خدا کر کے بے تابی میں بھی افاقہ ہوا۔ اب ختم کارروائی کے دونوں ہاتھ رہ گئے۔ یہ ذرا ٹیڑھی کھیر تھی۔ جب تک کہنیاں اور گھٹنے نہ پھیلیں یہ کام کیونکر ہو۔ میں الماری میں تو پہلے ہی انگوٹھی کا نگینہ بنا بیٹھا تھا۔ اس پھیلاؤ کی جگہ لاؤں تو کہاں سے لاؤں۔ آخر زور کر کے کہنیاں اور گھٹنے کچھ نہ کچھ پھیلا ہی دئے۔ اس زور زنی میں پتلے تو ہیلو کے تختوں نے "چرڑ۔ چرڑ۔ چرچرڑ" کی۔ پھر ایک دفعہ جو زور دیا تو کہنیاں اور گھٹنے تختے توڑ پار نکل گئے۔ اب ہزار کوشش کرتا ہوں نہ کہنیاں نکلتی ہیں نہ گھٹنے نکلتے ہیں۔۔۔۔ ایک ہاتھ میں بھرا ہوا لوٹا۔ دوسرا ہاتھ ذرا نیچے کی طرف مائل۔۔۔ تھوڑی دیر کے لئے تو ہاتھ پاؤں مارے لیکن کہنیاں اور گھٹنے نہ چھوٹنا تھے نہ چھوٹے۔ اتنے میں دوسرے مسافروں نے نکلنے کا تقاضا کیا۔ پہلے تو میں ہوں ہوں کر کے ٹالتا رہا مگر جب گاڑی میں لیٹے ہوئے گھنٹہ بھر گزر گیا تو لاچار ایک مولوی صاحب سے جنہوں نے پانچویں چھٹی مرتبہ کھنکارا اور دروازہ کھٹکھٹایا تھا، میں نے کہا حضرت نکلوں تو کیونکر نکلوں، مجھ کو تو آپ کے صندوق نے پکڑ رکھا ہے، مجھ سے ہلا کب جاتا ہے۔ آپ ذرا دروازہ کھولئے۔۔۔۔"

مندرجہ بالا اقتباسات آپ نے دیکھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس انداز کی ظرافت میں مجھ ہی ایک خاص قسم کی صورت حال سے یا افراد کی کمزوریوں سے اور ان

کی ناہمواریوں سے ہنسی کو تحریک ہوتی ہے۔ فرحت بڑے کامیاب ہیں لیکن یہ ان کا خاص میدان نہیں ہے۔ ان کے جوہر تو ایسے مضامین میں کھلتے ہیں جہاں مزاح اُن کی رنگین بیانی، خوش مذاقی سے پیدا ہوتا ہے۔ فرحت کی دوسری قسم کی مزاحیہ تحریروں میں کچھ ایسے کردار بھی ملتے ہیں جو اپنی سماجی زندگی اور اس کے محاسن میں مثلاً اہم حقیقتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ان کرداروں میں نذیر صاحب بادر جیسے سماجی نمونے بھی ہیں اور ایسے بے تکے اور عجیب و غریب افراد بھی جو ایک خاص قسم کے سماجی [illegible] پیدا ہوئے ہیں۔ [illegible] ان کو بے ڈھنگے طور طریقوں سے پیدا کی ہے یہ ایک قسم کے مزاحیہ کردار ہیں لیکن کچھ انجانے ایسے بھی جن میں مسخرہ پن شامل ہے اور ان سے جو ظرافت پیدا ہوتی ہے وہ مقصود بالذات ہے یا [illegible] کے لفظوں میں ہمارا خیال ہے (Imaginative Emotional Energy یا Energy [illegible] جس سے پیدا ہوتی ہے۔ جہاں مرزا صاحب مبالغہ آمیز انداز [illegible] کے مضامین میں جہاں فرحت کو موقع ملتا ہے وہ لطیفوں یا چٹکلوں کا [illegible] گردیتے ہیں۔ مختصر فرحت کے مضامین کا سرسری جائزہ لینے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی قابلیت اپنے اظہار کے لئے کسی خاص موضوع کی محدود نہیں۔ خوش مذاقی، [illegible] مزاح [illegible] واقعات سے پیدا ہونے والی ظرافت، موضوع سماجی ہو سیاسی، سوانحی، تاریخی ہو یا خیالی، وہ اپنے شگفتہ [illegible] [illegible] کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ خوش مذاقی اور شوخ طبع [illegible] تو وہ بادشاہ ہیں۔ وہ اردو میں اسلوب سے پیدا ہونے والی ظرافت کے موجد ہیں گو اُن سے پہلے اس انداز کی جھلکیاں نظر آتی ہیں لیکن اسے مقبول عام کرانے والے وہی ہیں۔ انہیں خود بھی اس کا احساس [illegible] ہیں۔

* بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ [illegible] سے کچھ کام لینا مقصود تھا۔ وہ پورا

ہوگیا اور مجھ کو "اشخاصِ رفتہ" کی فہرست میں داخل کر دیا گیا" خوش مذاقی کی سڑک کی داغ بیل مجھ جیسے گمنام شخص کے ہاتھوں ڈلوائی گئی۔ فوراً ہی دوسرے ادیب کدال، پھاوڑے لے کر آ گئے۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں یہ راستہ ایسا صاف ہو گیا کہ ہر چھوٹا بڑا، اس پہ بے تکان چلنے لگا۔"

مرزا فرحت صاحب آپ یہ کیا فرماتے ہیں، کہ "مجھ کو اشخاصِ رفتہ" کی فہرست میں داخل کر دیا گیا" آپ تو نذیر احمد کی کہانی میں مسکراتے ہیں، مولوی صاحب سے شرارتیں کرتے ہیں، خود ہنستے ہیں دوسروں کو ہنساتے ہیں، "یادگار مشاعرہ" میں ماضی کو زندگی عطا کرتے ہیں مٹی ہوئی تہذیب و معاشرت میں جان ڈالتے ہیں۔ لوگوں کو زندہ دلی کے قصے سناتے ہیں آپ ہم سے دور سہی لیکن ایسے دور بھی نہیں کہ آپ سے ملاقات نہ ہو سکے۔ "ایک وصیت کی تعمیل" "نذیر احمد کی کہانی" میں ہم جب چاہیں آپ سے ہنس بول سکتے ہیں۔ خدارا اپنے تیئں شخصِ رفتہ کہہ کر ہمارا دل نہ دکھائیے ہم نے کبھی آپ کو "شخص رفتہ" نہیں سمجھا۔ آپ زندہ ہیں۔ آپ زندہ ہیں کیونکہ آپ کی شوخ تحریریں زندہ ہیں:

احسان الحق اختر

بی۔ اے آنرز۔ ایم۔ اے

۱۲۶۱ھ میں دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ

ا۔ تمہید

نام نیک رفتگاں ضائع مکن
تا بماند نام نیک برقرار

بقول غالب مرحوم انسان ایک محشرِ خیال ہے۔ لیکن خیال میں حشر بپا ہونے کے لئے کسی بیرونی تحریک کا ہونا لازمی ہے۔ دماغ خیال کا گنجینہ ہے لیکن اس گنجینے کے کھلنے کے واسطے کسی ظاہری اسباب کی کنجی کی ضرورت ہے مجھے بچپن سے شعرائے اردو کے حالات پڑھنے اور سننے کا شوق رہا مگر کبھی کوئی ایسی تحریک نہیں ہوئی جو ان کے حالات کو ایک جگہ جمع کرنے کا خیال پیدا کرتی اور یہ خیالات الفاظ کی شکل میں ظاہر ہو کر ایک خوشنما چلتی پھرتی تصویر بن جاتے۔

جب کوئی بات ہونے والی ہوتی ہے تو اسباب خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ اتفاق دیکھئے کہ پرانے قدیم کاغذات میں مجھ کو حکیم مومن خاں دہلوی کی ایک قلمی تصویر ملی تصویر کا ملنا تھا کہ یہ خیال پیدا ہوا کہ شمس العلما محمد حسین آزاد مرحوم کے نیرنگِ خیال کی محفلِ شعراء کی طرح ایک مشاعرہ قائم کر، مگر ان لوگوں کے کلام پر تنقید کرنے

کی بجائے صرف ان کی چلتی پھرتی تصویریں دکھا خیال میں رفتہ رفتہ پختگی ہوئی اور اس چچی خیال نے ایک مشاعرہ کا خاکہ پیش نظر کر دیا لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مختلف زمانوں کے شاعروں کو کس طرح ایک جگہ جمع کروں اس عقدہ کو امیر اللہ تسلیم مرحوم کے اس شعر نے حل کر دیا۔

جوانی سے زیادہ وقت پیری جوش ہوتا ہے   بھڑکتا ہے چراغِ صبح جب خاموش ہوتا ہے

اس شعر کا یاد آنا تھا کہ شعرائے دہلی کا آخری دور آنکھوں کے سامنے پھر گیا اور دل میں یہ بات جم گئی کہ بجائے تمام شعرائے اردو کے دہلی کے آخری دور کا نقشہ کھینچ دیا جائے۔

قاعدہ کی بات ہے کہ مرنے سے پہلے بیمار سنبھالا لیتا ہے اردو شاعری کے حق میں بہادر شاہ ثانی کا زمانہ بھی دہلی کا سنبھالا تھا۔ بادشاہت برائے نام تھی اور جو تنخواہ بادشاہ سلامت کو ملتی تھی اس میں قلعے کا خرچ بھی مشکل سے چلتا تھا۔ برخلاف اس کے دکن اور اودھ میں دولت کی گنگا بہہ رہی تھی۔ دریائے جمنا کی چمکیلی ریت دہلی والوں کے لئے نقرہ فریب رہی اور اس اجڑے دیار میں شعراء ہی نہیں بلکہ ہر فن کے کاملوں کا ایک ایسا مجمع ہو گیا جس کی نظیر ہندوستان تو ہندوستان دوسرے کسی ملک میں بھی ملنی دشوار ہے زمانہ ایک رنگ پر نہیں رہتا ۱۸۵۷ء سے قبل ہی ان کاملین فن میں بہت سے تو ملک عدم کو سدھارے جو بچے کھچے رہ گئے تھے ان کو غدر کے طوفان نے تتر بتر کر دیا جس کو جہاں کچھ سہارا ملا وہیں کا ہو رہا۔ دہلی برباد ہو کر حیدرآباد اور رامپور آباد ہوئے۔ اکثر شرفا گھروں سے ایسے نکلے کہ پھر ان کو دہلی کی صورت دیکھنی نصیب نہ ہوئی جو وہاں رہ گئے ہیں۔ وہ چلنے چلانے کو تیار بیٹھے ہیں۔ بہت سے اٹھ گئے بہت سے اٹھتے جاتے ہیں۔ اور ایک زمانہ وہ آنے والا ہے کہ کوئی یہ بتانے والا بھی نہ رہے گا کہ مومن مرحوم کا کہاں تھا جس طرح سوائے میرے اب شاید کسی کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کی قبر کہاں ہے۔

ان حالات کو دیکھ کر مجھے خیال آیا اس خیال کی محرک مومن مرحوم کی

تصویر بھی ہوئی کہ اردو کے لئے، ان سے ایک ایسا چراغ تو روشن کر لیں کہ جس کی روشنی میں آنے والی نسلیں زبانِ اردو کے ان محسنوں کی شکلیں دخواہ وہ دھندلی ہی کیوں نہ سہی)، دیکھ سکیں اور ان کا کلام پڑھتے وقت کم سے کم ان کی صورتوں کا ایک موہوم سا نقشہ پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے پھر جائے جو لوگ علمی مذاق رکھتے ہیں وہ جانتے اور سمجھتے ہیں کہ کسی کا کلام پڑھتے وقت اگر اس کی شکل و صورت حرکات و سکنات آواز کی کیفیت نشست و برخاست کے طریقے ، طبیعت کا رنگ اور سب سے زیادہ یہ کہ اس کے لباس اور وضع وقطع کا خیال دل میں رہے تو اس کا کلام ایک خاص اثر پیدا کر دیتا ہے اور پڑھنے کا لُطف دوبالا ہو جاتا ہے ۔ ورنہ مصنف کے حالات سے واقف ہوئے بغیر اس کی کسی کتاب کا پڑھ لینا گراموفون کے ریکارڈ سننے سے زیادہ موثر نہیں ہوتا. یہی وجہ ہے کہ آج کل مہذب ممالک کے کسی مصنف کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوتی جس کے شروع میں اس کے حالات درج نہ کئے جائیں اور وہ واقعات نہ لکھائے جائیں جن کی موجودگی میں وہ تصنیف ضبط تحریر میں آئی ۔ یہی خیالات تھے جنہوں نے مجھے ان چند اوراق کے لکھنے پر آمادہ کیا ۔ اس البم میں آپ ایسی بہت سی تصویریں دیکھیں گے جو ان کاملینِ فن نے اپنے ہاتھ سے خود کھینچی ہیں ۔ بہت سے ایسے مرقعے پائیں گے ۔ جو دوسرے مصوروں کے ہاتھ کے بنے ہوئے ہیں بعض. ایسے نقش و نگار ملیں گے جو فوٹو یا قلمی تصاویر دیکھ کر الفاظ میں اتار دیئے گئے ہیں. اکثر و بیشتر ایسی صورتیں ہوں گی جو خود مَیں نے بڑے بوڑھوں سے پوچھ کر بنائی ہیں. لیکن ہر صورت میں شہادت تائیدی کے مقابلہ میں شہادت تردیدی کو زیادہ وقعت دی ہے یعنی اگر کسی واقعہ کے متعلق ایک بھی مخالف بات معلوم ہوئی تو اس واقعہ کو قطعاً ترک کر دیا اگر اتنے سارے حُلیے ایک جگہ جمع ہی ہو جاتے تو یقیناً یہ مرقع

فن سے پردوں کا رجسٹر بن کر بے تعلق ہوجاتا لیکن ادھر تو آزاد مرحوم کے نیرنگ خیال نے دل میں مشاعرے کا خیال ڈالا ادھر کریم الدین مغفور کی کتاب طبقات الشعرائے ہند کے طبقہ چہارم نے رجب سنہ ۱۲۶۱ھ کے ایک مشاعرے کا پتہ دیا۔ اب کیا تھا دونوں کو ملا کر ایک مضمون پیدا کر لیا۔ رہی رنگ آمیزی اس کی تکمیل میں خود کیے دیتا ہوں۔ البتہ اچھے بُرے کی ذمہ داری نہیں لیتا۔ بحیثیت مؤرخ ۱۲۶۱ھ کے واقعات میں خود اس طرح لکھ سکتا تھا گویا یہ میرے چشم دید ہیں اور ؎

ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام ۔۔۔ ہفتصد ہفتاد قالب دیدہ ام

پر نظر رکھتے ہوئے اس زمانہ کا بھی مرزا الم نشرح، بن سکتا تھا۔ مگر میرے دل نے گوارا نہیں کیا کہ کریم الدین مرحوم کی کامیابی کا سہرا اپنے سر پر باندھوں اور ایسے شخص کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دوں جس نے اس مشاعرے میں بہت بڑا حصہ لیا تھا جس کے مکان پر یہ مشاعرہ ہوا تھا اور جو اس مشاعرے کی روح رواں تھا۔ یہ ضروری ہے کہ اس کی یہ مجلس محدود تھی اور میں نے اس کو اتنی وسعت دی ہے کہ اس زمانہ کے تقریباً سب بڑے بڑے شعرا کو اس میں لا بٹھایا ہے۔ اب اس میں مجھے کامیابی ہوتی یا نہیں اس کا اندازہ قارئین کرام فرما سکتے ہیں۔ اگر ہوتی ہے تو زہے نصیب، میری محنت ٹھکانے لگی اگر نہیں ہوئی تو کم سے کم یہی سمجھ کر میری داد دی جائے کہ مرزا صاحب نے بات تو پیدا کی تھی مگر نباہ نہ سکے جو ان سے نہیں ہوا وہ اب ہم کر دکھاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس طرح کوئی قلم کا دھنی "ان خفتگان خاک" کا کوئی ایسا مرقع تیار کر دے جو بزم ادب اردو میں سجانے کے قابل ہو۔

لیجیے میں اب مولوی کریم الدین صاحب کی جگہ حاضر ہوتا ہوں لیکن یہ ضرور عرض کیے دیتا ہوں کہ جب میں اپنی تمام محنت کریم الدین صاحب کی نذر کر رہا ہوں تو جو کچھ بُرا بھلا آپ کو اس مضمون کے متعلق کہنا ہے وہ مجھے نہ کہیے مولوی صاحب کو کہیے اور خوب دل بھر کر کہیے میں خوش اور میرا خدا خوش۔

والسلام۔

تدبیر

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

میرا نام کریم الدین ہے۔ میں پانی پت کا رہنے والا ہوں یہ قصبہ دہلی سے ۵۳ کوس بجانب شمال مغرب واقع ہے اور اپنی لڑائیوں کی وجہ سے تاریخ میں مشہور ہے ہم اچھے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ مولویوں کا خاندان تھا لیکن زمانے کی گردش نے ایسا پیسا کہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گئے جائداد ضبط ہو گئی میرے دادا صاحب قبلہ ایک مسجد میں جا بیٹھے اور اللہ اللہ کر کے گزار دی۔ جب ضبط شدہ جائدادوں کے متعلق دریافت شروع ہوئی تو توکل نے ان کا دامن پکڑ لیا اپنی جگہ سے نہ ہلے نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیشہ کے لئے روٹیوں کا سہارا کھو بیٹھے۔ میرے والد سراج الدین مرحوم بمصداق "عصمت بی بی از بے چادری" متوکل بنے رہے اور مسجد میں ایسے بیٹھے کہ مر کر اٹھے میں ۱۲۳۶ھ میں عید الفطر کے دن پیدا ہوا میری تعلیم ان ہی دونوں بزرگوں کے ہاتھوں ہوئی لیکن بے چین طبیعت اور خاندانی جھگڑوں نے آخر پانی پت چھڑایا۔ اس زمانہ میں دہلی میں علم کا بڑا چرچا تھا۔ ہر فن کے کاملوں سے دہلی بھری پڑی تھی۔ ہر سمت علم کے چشمے جاری تھے "ملا کی دوڑ مسجد" میں بھی پانی پت چھوڑ کر دہلی آ گیا

کاپی نویسی سے گزارہ کرتا۔ محنت و مزدوری کے بعد ذوق علم حلقہ درس میں کھینچے جاتا اسی زمانے میں دہلی کالج کی تنظیم جدید ہوئی تھی۔ طالب علموں کی تلاش تھی میں بھی ۱۸ سال کی عمر میں وہاں شامل ہو گیا۔ سولہ روپیہ وظیفہ بھی مقرر ہوا اور اس طرح میں نے علم کی پیاس بڑی حد تک بجھائی۔ لیکن یہ وہ زمانہ نہیں تھا کہ علم کو علم کے لئے حاصل کیا جاتا اب اس کے ساتھ گزارے کی ایک بڑی شق لگ گئی تھی اس لئے چند دوستوں کے ساتھ مل کر ایک مطبع کھولا قاضی کے حوض پر

مبارک النساء بیگم کی حویلی کرایہ پر لی عربی کی مشہور کتابوں کے ترجمے چھاپے لیکن مطبع جیسا چلنا چاہیئے تھا نہ چلا۔ یہ اردو شاعری کے شباب کا زمانہ تھا بادشاہ سے لیکر فقیر تک سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے خیال آیا کہ ایک مشاعرہ قائم کرکے شعراء کے حالات اور ان کا کلام طبع کروں ممکن ہے کہ اس طرح مطبع چل جائے۔ مجھے شاعری سے نہ کبھی لگاؤ تھا اور نہ اب ہے بلکہ شعر کہنا میں برا جانتا ہوں کیونکہ اہل علم کا یہ پیشہ نہیں ہے وہ لوگ جو معیشت سے فارغ البال ہیں اپنا دل بہلانے اور حسرت نکالنے کے لئے شاعری کرتے ہیں ۔

میں خود عالم ہوں میرے باپ دادا عالم تھے بھلا میں تو اس قسم کی فضولیات کی طرف توجہ بھی نہ کرتا مگر کیا کروں ضرورت سب خیالات پر حاوی ہو گئی اور مجھے قیام مشاعرہ پر مجبور کیا۔ لیکن بڑی مصیبت یہ ہے کہ ایک تو اس شہر میں غریب اور خاص کر پردیسی غریب کو منہ نہیں لگاتے۔ دوسرے یہ کہ میری جان پہچان تھی تو مولویوں سے وہ بھلا اس معاملہ میں میرا کیا ساتھ دے سکتے تھے۔ سوچتے سوچتے نواب زین العابدین خاں عارف پر نظر پڑی ان سے دو چار دفعہ ملنا ہوا تھا۔ بڑے خوش اخلاق آدمی ہیں ملال کنوئیں کے پاس ایک حویلی ہے اس کو مدرسہ بھی کہتے ہیں وہاں رہتے ہیں کوئی ۳۰ سال کی عمر ہے۔ گوری رنگت اونچا قد اور نہایت جامہ زیب آدمی ہیں۔ البتہ ڈاڑھی بھر کر نہیں نکلی ہے ٹھوڑی ہی پر کچھ گنتی کے بال ہیں غالب کے بھانجے بھی ہیں اور شاگرد بھی کچھ عرصہ تک شاہ نصیر سے بھی اصلاح لی ہے بہرحال ان کی محبت۔ ان کی شرافت اور سب سے زیادہ ان کے رسوخ نے مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہونے اور اس بارے میں ان کی امداد حاصل کرنے پر مجبور کیا۔ ایک روز صبح ہی صبح گھر سے نکل ان کے مکان پر پہنچا معلوم ہوا کہ وہ حکیم احسن اللہ خان صاحب وزیر اعظم کے مکان پر تشریف لے گئے ہیں حکیم صاحب کا مکان سرکی والوں میں

تھا واپسی میں دروازے پر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ نواب زین العابدین خان اندر ہیں چوبدار کے ذریعہ سے اطلاع کرائی۔ انھوں نے اندر بلا لیا۔ بڑا عالیشان مکان ہے صحن میں نہر ہے سامنے بنگلہ چبوترا ہے اور چبوترے پر بڑے شہ دالان در دالان مکان خوب آراستہ پیراستہ ہے ہر چیز سے امارت ٹپکتی ہے سامنے گاؤ تکیہ سے لگے نواب صاحب بیٹھے تھے۔ میں نے ان کو پہچانا بھی نہیں سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے اور چہرے پر جھرّیاں پڑ گئی تھیں میں نے سلام کر کے کیفیت پوچھی کہنے لگے مولوی صاحب کیا کہوں کچھ دل بیٹھا جاتا ہے۔ بظاہر کچھ مرض بھی معلوم نہیں ہوتا علاج کرا رہا ہوں مگر بے نتیجہ، بھئی اب ہمارے چل چلاؤ کا زمانہ ہے۔ کچھ دنوں دنیا کی ہوا کھا رہے ہیں مگر یہ تو کہئے آج آپ کدھر نکل آئے میں نے واقعات کا اظہار کر کے ضرورت بیان کی تھوڑی دیر تک سوچتے رہے پھر ایک آہ بھر کر کہا میاں کریم الدین تم کو بات تو اچھی سوجھی ہے مگر بھئی اس کا نباہنا مشکل ہے تمہیں خبر نہیں دہلی کے پہلے مشاعروں نے کچھ دلوں میں فرق ڈال دیئے ہیں۔ دل تو میرا بھی چاہتا ہے کہ مرتے مرتے ایک ایسا مشاعرہ دیکھ لوں جس میں یہاں کے کاملین فن جمع ہو جائیں مگر مجھے یہ بیل منڈھے چڑھتی معلوم نہیں ہوتی اچھا تم بھی کوشش کر دیکھیں بھی کرتا ہوں ممکن ہے کہ کوئی صورت نکل آئے۔ ہاں ٹھہرو، حکیم صاحب کو آنے دو ایک تجویز ذہن میں آئی ہے اگر چل گئی تو میری بھی آخری خواہش پوری ہو جائے گی اور تمہارا بھی کام نکل جائے گا۔ ہم یہ باتیں کر رہے تھے کہ حکیم صاحب نکل آئے گورے چٹے آدمی ہیں سفید بھری ہوئی ڈاڑھی گول چہرہ اس پر کچھ کچھ چیچک کے داغ آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی سر سے پاؤں تک سفید لباس پہنے ہوئے تھے فن طب میں کامل اور تاریخ کے عالم ہیں میں آداب بجا لایا میری طرف مسکرا کر دیکھا اور نواب صاحب سے کہا آپ کی تعریف کیجئے۔ انھوں نے کہا: یہ میرے قدیم ملنے والوں میں سے ہیں خود شاعر نہیں مگر شعر فہم ہیں۔ آج کل خیال پیدا ہوا ہے کہ شعرائے دہلی کا تذکرہ

لکھیں اور اس میں ان کے تخلیے اور ان کے کلام کے نمونے دکھائیں مجھ سے مشورہ کرنے آئے تھے ———— آپ جانتے ہیں کہ مجھے ان چیزوں سے عشق ہے اب اپنے آخری وقت میں چاہتا ہوں کہ پرانے رنگ کا ایک مشاعرہ اور دیکھ لوں۔ اگر آپ مدد فرمائیں تو یہ مشکل آسان ہو سکتی ہے۔ حکیم صاحب کہنے لگے میاں عارف خدا کے لئے تم ایسی مایوسی کی باتیں نہ کیا کرو۔ ابھی جوان ہو انشا اللہ خود طبیعت مرض پر غالب آجائے گی اور تمہیں مرض ہی کیا ہے وہم ہی وہم ہے مگر ہاں یہ تو بتاؤ تم مجھ سے کس قسم کی مدد چاہتے ہو۔ نواب صاحب نے کہا حکیم جی اور کچھ نہیں اتنا کر دو کہ میاں کریم الدین کو بارگاہ جہاں پناہی تک پہنچا دو۔ میں خود جاتا مگر ہمت نہیں ہوتی میں ان کو بہت کچھ سمجھا دوں گا اگر حضرت ظل اللہ اپنا کلام بھیجنے پر راضی ہو گئے تو مشاعرہ کا جم جانا کوئی مشکل کام نہیں ہے اور اگر بدقسمتی سے انکار ہو گیا تو پھر مشاعرہ کا خیال کرنا ہی فضول ہے۔ اب رہا مشاعرے کا انتظام وہ میں خود کر لوں گا۔ کیونکہ یہ بیچارے ان چیزوں کو کیا سمجھیں۔ حکیم صاحب پہلے تو کچھ سوچتے رہے پھر کہا "عارف تمہارے لئے میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ اس لئے اور بھی کروں گا کہ اس سے تمہاری طبیعت بہل جائے گی۔ اور کچھ دنوں اس شغلے میں لگ کر ممکن ہے کہ تمہارے دل سے مرض کا وہم جاتا رہے بادشاہ سلامت سے تو میں کہتا نہیں ہاں آپ کے دوست کو صاحب عالم مرزا فتح الملک[1] بہادر سے ملا دیتا ہوں ان کو آج کل مشاعرے کی لوگی ہوئی ہے حضور سے بھی کئی مرتبہ عرض کر چکے ہیں۔ مگر وہ ٹال گئے۔ اگر ان صاحب نے ذرا زور دیا تو مجھے

---

[1] ان کا نام مرزا فخر الدین خطاب مرزا فتح الملک شاہ بہادر عرف مرزا فخرو اور تخلص رمز تھا بہادر شاہ ثانی کے منجھلے بیٹے تھے مرزا محمد دارا بخت عرف مرزا شبو ولی عہد سلطنت کے انتقال کے بعد ۱۸۴۹ء میں ولی عہد ہوئے۔ مگر غدر سے پہلے ہی ۱۰ جولائی ۱۸۵۶ء میں ۴۰ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ان کے انتقال کے بعد مرزا جواں بخت کی ولی عہدی کے جھگڑے ہوئے۔

یقین ہے کہ صاحبِ عالم حسن کر ضرور اجازت حاصل کر لیں گے۔ اچھا مولوی صاحب کل آپ ایک بجے قلعہ معلّٰی میں آجائیے میں چوبدار سے کہے جاتا ہوں یہ اندر پہنچا دے گا۔ آگے آپ جانیں اور آپ کی قسمت یہ کہہ کر حکیم صاحب نے خدا بخش کو آواز دی وہ آیا تو اس سے کہا کہ کل یہ صاحب[1] حویلی میں ایک بجے آئیں گے۔ ان کو میری بیٹھک میں پہنچا دینا یہ کہہ کر وہ نواب صاحب کی طرف متوجہ ہو گئے اور میں آداب کر کے واپس چلا آیا۔

دوسرے روز ایک بجے کے قریب میں مولویانہ ٹھاٹھ سے جبّہ پہن شملہ باندھ قلعہ معلّٰی پہنچا۔ لاہوری دروازے کے باہر خدا بخش کھڑے ہوئے تھے وہ مجھ کو حکیم صاحب کی بیٹھک میں لے گئے یہ بیٹھک جس کو پہلے زمانہ میں "نشست " کہا جاتا تھا۔ دیوانِ عام سے ملی ہوئی تھی حکیم صاحب بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بولے، اجی مولوی صاحب میں نے آپ کا کام کر دیا ہے۔ صاحبِ عالم مرزا فتح الملک بہادر سے صبح ہی کو ملنا ہو گیا وہ اس تجویز سے بڑے خوش ہوئے فرماتے تھے: جہاں پناہ سے میں اجازت لئے لیتا ہوں۔ مگر مشاعرہ کا انتظام ایسا ہونا چاہیئے کہ ہم لوگ بھی آ سکیں۔ خیر بیٹھیے، شاید ابھی آپ کی یاد ہو۔ میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ بیٹھا ہی تھا کہ چوبدار نے آ کر کہا وہ کریم الدین کون صاحب ہیں ان کو حضور والا یاد فرماتے ہیں یہ سنا تھا کہ میرے پسینے چھوٹ گئے۔ میں سمجھا تھا کہ حکیم صاحب ہی کے پاس جا کر معاملہ طے ہو جائے گا یہ کیا خبر تھی کہ بارگاہ جہاں پناہی میں یاد ہو گی اور یاد بھی ایسے وقت کہ میرا سانس بھی پیٹ میں پوری طرح نہیں سمایا ہو گا۔ حکیم حاکم مرگِ مفاجات۔ اٹھا اور چوبدار کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔ تمام راستے آیت الکرسی پڑھتا رہا

[1] قلعہ دہلی کو لال حویلی بھی کہا جاتا ہے۔ حافظ عبدالرحمٰن احسان کا شعر ہے کہ:

مری تنخواہ لوٹی ان لٹیروں نے حویلی میں
بہادر شاہ غازی کی دہائی ہے دہائی ہے

آنکھ اٹھاکر یہ بھی نہ دیکھا کہ یہ بندہ خدا کدھر لئے جا رہا ہے۔ اندر سے قلعہ دیکھنے کا مدّت سے شوق تھا اب جو موقع ملا تو کن انکھیوں سے بھی دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی چلتے چلتے آندہ آ گئی آخر خدا خدا کرکے چوبدار نے دیوان خاص کی سیڑھیوں کے پاس لے جاکر کھڑا کر دیا اور آپ اندر اطلاع دینے چلا گیا۔ حضرت جہاں پناہ اس وقت حمام میں رونق افروز تھے۔ جن صاحبوں نے دہلی کا قلعہ نہیں دیکھا ہے۔ وہ شاید نہ سمجھ سکیں کہ گرمیوں میں حمام میں بیٹھنے کے کیا معنی اصل یہ ہے کہ حمام کیا ہے ایک عالیشان عمارت ہے اس کے دو درجے ہیں ایک گرم دوسرا سرد۔ عمارت کا جو حصہ موتی مسجد کی جانب ہے وہ گرم ہے اور جو جمنا کے رخ پہ ہے وہ سرد ہے۔ ریتی کے رخ خس کے پردے ڈال کر خس خانہ بنا لیا جاتا ہے۔ اندر نہر بہتی ہے بیچ میں کئی بڑے بڑے حوض ہیں ان میں فوارے چلتے ہیں۔ حمام کیا ہے ایک بہشت کا ٹکڑا ہے چوبدار جو گیا تو آنے کا نام نہیں لیتا۔ دھوپ میں کھڑے کھڑے فشار ہو گیا۔ پسینہ میں تر بتر گردن نیچی کئے کھڑا ہوں اور ناک سے پسینہ کی بوندیں ٹپک رہی ہیں ارادہ تھا کہ واپس چلا جاؤں۔ مگر اول تو طلبی کے بعد بھاگ جانا ہی نازیبا ہے دوسرے راستہ کس کو معلوم۔ خدا خدا کرکے مشکل آسان ہوئی اور چوبدار نے آ کر کہا کہ چلئے۔ اس ایک لفظ نے خود بخود پاؤں میں لغزش اور دل میں کپکپی پیدا کر دی خیر کسی نہ کسی طرح الٹے سیدھے پاؤں ڈالتا حمام مبارک میں داخل ہو گیا۔ چوبدار نے آواز دی ادب سے نگاہ روبرو حضرت جہاں پناہ سلامت آداب بجا لاؤ، میں نواب زین العابدین خاں صاحب سے یہ سبق پورا پورا اچھی طرح پڑھ کر آیا تھا دوہرا ہو کر سات تسلیمات بجا لایا اور نذر گزرانی نذر دیتے وقت ذرا آنکھ اونچی ہوئی تو وہاں کا رنگ دیکھا۔ حضرت پیر و مرشد ایک چاندی کی پلنگڑی پر لیٹے تھے پائنتی مرزا فخرو بیٹھے پاؤں دبا رہے تھے دہلی میں وہ کون ہے جس نے حضرت ظل اللہ کو نہیں دیکھا۔ میانہ قد بہت نحیف جسم

کسی قدر لمبا چہرہ بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ آنکھوں کے نیچے کی ہڈیاں بہت ابھری ہوئی لمبی گردن، پچکا ذرا سا اونچا، پتلی ستواں ناک، بڑا دہانہ گہری سانولی رنگت۔ سر منڈا ہوا چھدری ڈاڑھی کھل پہ بہت کم۔ ٹھوڑی پہ زیادہ، لبیں کترّی ہوئی ۸۰ برس سے اونچی عمر تھی۔ بال سفید ہو گئے تھے لیکن پھر بھی ڈاڑھی میں اکا دکا سیاہ بال تھا۔ چہرہ پہ جھریاں تھیں لیکن باوجود اس پیرانہ سالی اور نقاہت کے آواز میں وہی گرارہ پن تھا سبز کمخواب کا ایک بڑا پاجامہ سفید ململ کی ململ کا کرتہ زیب بدن تھا۔ سامنے ایک چوکی پہ جامہ وار کی خفتان اور کار چوبی چوگوشہ ٹوپی رکھی ہوئی تھی۔ اب رہے مرزا فخرو تو وہ عین بہ عین باپ کی تصویر تھے۔ ۳۲-۳۳ برس کی عمر تھی۔ فرق تھا تو بس یہی کہ وہ بڈھے تھے، یہ جوان۔ ان کا رنگ بڑھاپے کی وجہ سے ذرا کلونس لے آیا تھا۔ ان کا کھلا گیہواں رنگ تھا۔ ان کی ڈاڑھی سفید تھی۔ ان کی سیاہ۔ ورنہ یہی معلوم ہوتا تھا کہ ایک بادشاہ لیٹے ہیں اور ایک بیٹھے ہیں۔ دونوں نے مجھ پہ ایک گہری نظر ڈالی اور بادشاہ سلامت نے فرمایا:

"اماں[1] تمہارا ہی نام کریم الدین ہے تم کہیں باہر کے معلوم ہوتے ہو"

میں نے کہا کہ "خانہ زاد پانی پت کا رہنے والا ہے بچپن ہی سے ظل اللہ کے سایہ عاطفت میں آ رہا ہے۔" فرمایا "اماں! ابھی تمہارا ہی تذکرہ مرزا فخرو کر رہے تھے۔ میرا خود جی چاہتا ہے کہ پہلے کی طرح دیوان عام میں مشاعرہ کر دوں۔ مگر کیا کروں

---

[1] شاہان دہلی ہمیشہ وقت مرد و عورت دونوں کو "اماں" سے خطاب کیا کرتے تھے چنانچہ اس طرز کلام کی جھلک اب تک حیدرآباد میں پائی جاتی ہے مجھے بڑا تعجب ہے کہ ایک مورخ نے اس طریقہ مخاطبت کی بنا پر قطع معنٰی کی تہذیب اخلاق پر حملہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ "بادشاہ کے اخلاق کی پستی کا اندازہ اس سے کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو بھی "اماں" کہتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ صاحب انگریزی رباتی ص۶۴ پر)

زمانے کی ہوا ایسی بگڑ گئی ہے کہ مناسب معلوم نہیں ہوتا یہ صحیح ہے کہ "ہم ہم پیشہ باہم پیشہ دشمن" لیکن خدا محفوظ رکھے ایسی دشمنی بھی کس کام کی کہ دو گھڑی مل جل کر نہ بیٹھنے دے۔ دیوانِ عام میں مشاعرہ ہوتا تھا۔ وہ کچھ دنوں ٹھیک چلا پھر میں نے دیکھا کہ بے لطفی بڑھ رہی ہے۔ اس لئے بند کر دیا منشی فیض پارسا نے اجمیری دروازے کے باہر غازی الدین خاں کے مدرسہ میں مشاعرہ شروع کیا وہ تیلیل کی طرح بکھر گیا وہ تو کہو غنیمت ہوا کہ ردیف میں "تیلیاں" ہی تھیں کہیں خدا نخواستہ اگر ردیف "کٹاریاں" ہوتی تو خدا معلوم کتنوں کے سر پھوٹ جاتے تم مشاعرہ تو کر رہے ہو مگر ان ہاتھیوں کی ٹکر کیسے سنبھالو گے استاد ذوقؔ تو بے چارے بے زبان آدمی ہیں۔ مگر خدا بچائے حافظ ویرانؔ سے وہ ضرور لڑ مریں گے اور تم جانتے ہو اندھے کی داد نہ فریاد اندھا مار بیٹھے گا۔ کسی نے اگر مشاعرے میں استاد پر ذرا بھی چوٹ کر دی تو ان نابینا صاحب کا سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔

میاں تم سے کام سنبھلتا نظر نہیں آتا۔ میں نے عرض کی قبلۂ عالم! میری کیا ہمت ہے۔ جو میں اتنے بڑے کام میں ہاتھ ڈال سکوں۔ مشاعرہ کا سارا انتظام نواب زین العابدین عارفؔ نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ فرمایا تو مجھے اطمینان ہے۔ یہ لڑکا بڑا ہوشیار اور ذہین ہے۔ مرزا نوشہ اور مومن خان کو وہ سنبھال لیگا۔

نہیں جانتے تھے ورنہ ان کو پڑھ کر تعجب ہوتا کہ جس قوم کو وہ تہذیب کا پتلا اور اخلاق کا نمونہ ظاہر کرتے ہیں ان کے ہاں بھی خاوند اپنی بیوی کو "اماں" ہی کہتا ہے اور بیوی خاوند کو کبھی "آبا" کبھی "دادا" پکارتی ہے۔ میرے خیال میں یہ "ارے میاں" کا اختصار ہے۔ چنانچہ اب بھی بے تکلف بول چال میں میاں کو اماں ہی کہہ جاتے ہیں

رہے استاد ذوق ان سے میں کہہ دوں گا خدا نے چاہا تو اس طرح مشاعرہ چل جائے گا مگر میں یہ کہے دیتا ہوں کہ مشاعرے سے پہلے ان لوگوں سے مل لو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وقت پر انکار کر بیٹھیں۔ میں اور مرزا شبو تو نہیں آ سکتے ہیں ہاں مرزا فخرو کو اپنی جگہ بھیج دوں گا۔ اور ماشاء اللہ اپنی غزل بھی بھیجوں گا۔ ہاں یہ تو بتاؤ کہ تم نے "طرح" کیا رکھی ہے "طرح" ہی تو بڑے جھگڑے کی چیز ہے۔ یہ ذرا سوچ سمجھ کر دینا۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ باہر سے آواز آئی "لے ہے یہ اتا بچہ کیسے طرح ملا گئی ہے"۔ یہ سنتے ہی بادشاہ سلامت نے فرمایا "لو بھائی! یہ خود بخود قافیہ کی گتھی مل گئی تم اس مشاعرے میں کوئی "طرح" ہی نہ دو۔ جس شخص کا جس بحر، جس ردیف قافیہ میں غزل پڑھنے کو دل چاہے پڑھے نہ لینا ایک نہ دینا دو" میں نے عرض کی "تاریخ" فرمایا "۱۴ رجب مقرر کر دو۔ دن بھی اچھا ہے۔ چاندنی رات بھی ہوگی۔ آج پانچ تاریخ ہے نو دن باقی ہیں۔ اتنے دنوں میں بہت کچھ انتظام ہو سکتا ہے۔ ۲۰ جولائی پڑے گی۔ موسم بھی ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اچھا اب خدا حافظ۔ میں عمر و دولت و اقبال کو دعا دی اور خوش خوش الٹے پاؤں واپس ہوا۔ مرزا فخرو بیچ میں کچھ نہیں بولے مگر یہ سمجھتا تھا کہ یہ سب کچھ کیا دھرا انہیں کا ہے ورنہ کہاں میں اور کہاں خلوت شاہی۔ سچ ہے "بگڑی بن جاتی ہے جب فضل خدا ہوتا ہے"۔ یہاں میں اتنا ضرور کہوں گا کہ میرے لئے حضوری اتنا مشکل کام نہ تھا جتنا یہ الٹے پاؤں واپس ہونا۔ زمین پاؤں کو نہیں لگتی تھی۔ اس لئے دو چار قدم ہی چلا ہوں گا کہ دیوار سے ٹکر کھائی۔ اس ٹکر سے نہیں سنبھلا تھا کہ نہر میں پاؤں جا پڑا خیر بزار دقت باہر نکل ہی آیا ادھر میں نکلا ادھر چوبدار ساتھ ہوا۔ اس کو انعام دے دلا کر ٹالا۔ حکیم صاحب کے پاس آیا۔ وہ میرے انتظار میں بیٹھے تھے ان سے تمام واقعہ بیان کیا۔ فرمانے لگے مولوی صاحب بات یہ ہے

کہ مرزا فخرو بہت دنوں سے مشاعرے کے لئے بے چین ہو رہے تھے ان ہی کی یہ کارگزاری ہے ورنہ بھلا یہ معاملہ اس طرح تھوڑا ہی طے ہوتا۔ مگر چلو تمہارا کام بن گیا۔ میاں عارف سے جاکر کہہ دو۔ وہ میرے ہی ہاں بیٹھے انتظار کر رہے ہوں گے۔

حکیم صاحب کے مکان پر پہنچا تو دیکھا کہ واقعی نواب صاحب میرے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ ان سے حالات بیان کئے کہنے لگے کہ چلو یہ مشکل تو آسان ہوئی۔ اب تم یہ کام کرو کہ کل کم سے کم استاد ذوقؔ۔ مرزا نوشہ اور حکیم مومن خاں کے مکان کا گشت لگا ڈالو مگر دیکھنا ذرا پھونک پھونک کر قدم رکھنا یہ تینوں بڑے دماغ دار آدمی ہیں۔ اگر ذرا بھی تم سے بات چیت میں لغزش ہوئی تو یاد رکھو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ جب دیکھو کہ ان میں سے کوئی ہاتھوں سے نکلا ہی جاتا ہے تو میرا نام لے دینا۔ امید ہے کہ میرا نام سن کر شاید راضی ہو جائیں دوسری بات یہ ہے کہ مبارک النساء بیگم کی حویلی جس میں تمہارا مطبع ہے دو روز میں خالی کر کے بالکل میرے حوالے کر دو مجھے وہاں نشست کا انتظام کرنا ہوگا۔

مَیں نے کہا اور مَیں کہاں جاؤں فرمانے لگے۔ میرے مکان میں آٹھ آٹھ نو روز کے لئے آ جاؤ۔ تم کو تکلیف تو ہوگی۔ مگر کیا کیا جائے۔ جب قلعہ کے لوگوں کو بلا رہے ہیں تو ان ہی کے رتبے کے موافق مکان کو بھی درست کرنا ہوگا دیکھئے خرچ کیا پڑتا ہے۔ مَیں نے کہا مشاعرہ میں خرچ ہی ایسا کون سا ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ سو سوا سو روپیہ اٹھ جائیں گے۔ یہ سن کر نواب صاحب مسکرائے اور کہا "میاں کریم الدین تم کیا جانو کہ ایسے مشاعروں میں کیا خرچ ہوتا ہے۔ ہزار دو ہزار میں بھی اگر پورا ہو گیا تو سمجھو کہ سستے چھوٹے۔ یہ سن کر میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ مَیں نے کہا نواب صاحب اگر یہ صورت ہے تو میرا ایسے

مشاعرے کو دور ہی سے سلام ہے۔ مطبع تو مطبع اگر اپنے آپ کو بھی بیچ ڈالوں تو اتنی رقم نہ اٹھے۔ فرمانے لگے بھئی تم اس خرچ کے جھگڑے میں نہ پڑو۔ خدا یہ مشکل بھی آسان کر دے گا۔ جب میں نے اس کام میں ہاتھ ڈالا ہے تو میں جانوں اور میرا کام جانے تم بیٹھے تماشا دیکھو۔ مگر ہاں مکان کل تک خالی کر دینا۔ نو ہی دن تو رہ گئے ہیں۔ سات کمرا ہوا انگ بہت ہے۔ اب جاؤ خدا حافظ تم تھک بھی گئے ہو۔ ذرا آرام لے لو۔ اور کل صبح ہی سے ادھر مکان خالی کرنے کی فکر کرو۔ ادھر ان تینوں استادوں کے مکان کا چکر لگاؤ مکان خالی ہو جائے۔ تو فوراً مجھے اطلاع دینا اور خود میرے ہاں چلے آنا اس میں شرم کی کون سی بات ہے آخر میری ہی وجہ سے تم اپنا مکان چھوڑ رہے ہو۔" وہاں سے نکل کر میں اپنے گھر آیا مطبع بند کرتے کرتے اور سامان سمیٹتے سمیٹتے شام ہو گئی۔ صبح اٹھ کر لینے پہننے اوڑھنے کا سامان نواب زین العابدین خان کے مکان پر روانہ کیا اور خود کابلی دروازے کی طرف چلا کہ پہلے استاد ذوق ہی سے بسم اللہ کیجئے۔ کابلی دروازہ کے پاس ہی ان کا مکان ہے مکان بہت چھوٹا ہے چھوٹی سی ڈیوڑھی ہے۔ اس میں ایک طرف جائے ضرور ہے۔ اندر صحن اتنا چھوٹا ہے کہ دو پلنگ بچھنے کے بعد راستہ چلنے کے لئے مشکل سے جگہ رہتی ہے۔ سامنے چھوٹا سا دالان ہے۔ اور اس کے اوپر ایک کمرہ صحن میں سے زنانے مکان میں راستہ جاتا ہے۔ جب میں پہنچا تو استاد صحن میں بان کی کھرّی چارپائی پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ دوسری چارپائی پر ان کے چہیتے شاگرد حافظ غلام رسول ویران بیٹھے تھے۔ یہ اندھے ہیں اوسان ہی سے ہوشیار رہنے کے لئے حضرت جہاں پناہ نے ارشاد فرمایا تھا۔ استاد ذوق قد و قامت میں متوسط اندام ہیں رنگ اچھا سانولا ہے۔ چہرے پر چیچک کے داغ ہیں۔ آنکھیں بڑی بڑی اور

روشن اور نگاہیں تیز ہیں۔ چہرے کا نقشہ کڑاکڑا ہے اس وقت سفید تنگ پاجامہ سفید کرتہ اور سفید ہی انگرکھا پہنے ہوئے تھے۔ سر پر گول چندوے کی ململ کی ٹوپی تھی۔ میرے پاؤں کی آہٹ سنتے ہی حافظ ویران نے چونک کر کہا۔ کون ہے میں نے کہا کریم الدین، استاد ذوق کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ استاد نے اپنا نام سن کر کہا۔ کہیئے آیئے اندر تشریف لایئے میں نے آداب عرض کیا۔ انہوں نے فرمایا بیٹھو بھی بیٹھو میں حافظ ویران کے پاس چارپائی پر بیٹھ گیا۔ کہا: "فرمایئے۔ کیسے تشریف لانا ہوا؟" میں نے عرض کی کہ "میرا ارادہ قاضی کے حوض پر ایک مشاعرہ شروع کرنے کا ہے، ۱۴ رجب تاریخ مقرر ہوئی ہے اگر حضور بھی ازراہ بندہ نوازی قدم رنجہ فرمائیں تو بعید از کرم نہ ہوگا۔" میرا اتنا کہنا تھا کہ حافظ ویران تو چراغ پا ہو گئے۔ کہنے لگے جایئے جایئے کہاں کا مشاعرہ نکالا ہے۔ استاد کو فرصت نہیں ہے۔ ان مرزا کے ہاں[1] کے پاس کیوں نہیں جاتے جو خواہ مخواہ ان کو آکر دق کرتے ہو۔" استاد نے کہا "بھئی حافظ ویران تمہاری زبان نہیں رکتی بیٹھے بٹھائے تم دنیا بھر سے لڑائی مول لیتے ہو۔" حافظ ویران کہنے لگے: "استاد

---

[1] ان دنوں دہلی میں لوگوں نے یہ اڑا رکھا تھا کہ مرزا نوشہ (غالب) مرزا عبداللہ بیگ کے نہیں ہیں بلکہ انہوں نے ان کو پال لیا ہے۔ اور یہ دراصل کسی کشمیری کی اولاد ہیں حافظ ویران نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ خدا محفوظ رکھے دہلی والوں سے جو باہر سے آیا اس کے حسب و نسب میں انہوں نے کیڑے ڈالے۔ استاد ذوق کو شہر بھر نائی کہتا ہے یہ دوسری بات ہے کہ آزاد مرحوم نے ان کے ہاتھ میں استرے کی بجائے تلوار دے کر ان کو سپاہی زادہ بنا دیا ہے۔

جب وہ آپ کو بُرا بھلا کہیں تو ہم کیوں چپ بیٹھنے لگے"۔ وہ ایک کہیں گے تو ہم سو سنائیں گے اور تو اور میاں آشفتہ کو دن لگے ہیں کل ہی کی بات ہے۔ آپ کو تاؤ چڑھا کہہ رہے تھے مگر میں نے ایسی خبر لی کہ تمام عمر یاد کریں گے۔ ان کی سات پشت کو تو م ڈالا۔ استاد ہنس کر فرمانے لگے "تا بھئی نا" تم میری وجہ سے کیوں نہ بلا میں پڑتے ہو۔ مجھے جس کا جو جی چاہے سو کہے میں نے تو ان سب کا جواب ایک رباعی میں دے دیا ہے ؎

تو بھلا ہو تو بُرا ہو نہیں سکتا اے ذوق
ہے بُرا وہ ہی کہ جو تجھ کو برا جانتا ہے
اور اگر تو ہی بُرا ہے تو وہ سچ کہتا ہے
کیوں بُرا کہنے سے اس کے تو برا مانتا ہے

میں نے عرض کی کہ میں کل بارگاہ سلطانی میں حاضر ہوا تھا حضرت ظل اللہ نے ارشاد فرمایا تھا کہ اس مشاعرے میں ہم مرزا فتح الملک بہادر کو اپنی طرف سے بھیجیں گے اور اپنی غزل بھی بھیج کر مشاعرہ کی عزت بڑھائیں گے۔ یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ استاد ذوق سے بھی کہہ دیں گے۔ وہ بھی مشاعرہ میں ضرور آئیں۔ یہ سن کر حافظ ویران تیشند سے پڑ گئے۔ استاد نے فرمایا ہاں بھئی مجھے یاد آ گیا کل شام کو حضرت پیر و مرشد نے مجھ سے بھی فرمایا تھا۔ اور یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ تو بھی ضرور جائیو۔ میاں میں انشاءاللہ تعالیٰ ضرور آؤں گا۔ مگر یہ تو بتاؤ "طرح" کیا رکھی ہے میں نے واقعہ عرض کیا۔ اور کہا کہ "حضرت ظل سبحانی نے "طرح" کا جھگڑا ہی نکال دیا ہے۔ جو شخص جس بحر اور جس ردیف و قافیہ میں چاہے اگر غزل پڑھے تو استاد تو بہت خوب بہت خوب کہتے رہے مگر حافظ ویران کی تیوری کے بل نہیں گئے۔ برابر بڑبڑاتے ہی رہے کہ "اللہ خیر کرے۔ دیکھئے اس مشاعرے کا کیا حشر ہوتا ہے۔ حضرت پیر و مرشد بھی بیٹھے بیٹھے

اشقلے[1] چھوڑا کرتے ہیں"۔ وہ اپنی کہے گئے میں تو اُٹھ سلام کر چلا آیا۔

دوسرا حملہ اسد اللہ خان غالب پر تھا چاندنی چوک سے ہوتا ہوا بلی ماروں میں آیا حکیم محمود خاں صاحب کے مکان کے سامنے قاسم جان کی گلی کہی ہے۔ بائیں طرف پہلا ہی مکان ان کا تھا یہ مکان مسجد کے پیچھے ہے۔ اس کے دو دروازے ہیں ایک مردانہ دوسرا زنانہ۔ محل سرا کا ایک راستہ مردانے مکان میں سے بھی ہے۔ باہر کے دروازے کی دہلیز ذرا دھنسی ہوئی سی ہے۔ دروازے کے اوپر ایک کمرہ ہے اور کمرے کے دونوں پہلوؤں میں دو کوٹھڑیاں ہیں۔ گرمیوں میں مرزا صاحب دوپہر کے وقت اسی ایک کوٹھڑی میں رہا کرتے تھے۔ دروازے سے گزر کر مختصر سا صحن ہے اور سامنے ہی دالان در دالان۔ جب میں پہنچا تو اندر کے دالان میں گاؤ تکیہ سے لگے بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔

مرزا نوشہ کی عمر کوئی ۵۰، سال کی ہوگی۔ حسین اور خوش رو آدمی ہیں۔ قد اونچا اور ہاڑ بہت چوڑا چکلا۔ موٹا موٹا نقشہ اور سرخ سفید رنگ ہے۔ لیکن اس میں کچھ کچھ زردی جھلکتی ہے۔ ایسے رنگ کو محاورے میں چمپئی کہا جاتا ہے۔ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے ہیں۔ ڈاڑھی بھری ہوئی ہے۔ مگر گھنی نہیں ہے۔ سر منڈا ہوا اس پر سیاہ پوستین کی ٹوپی ہے جو کلاہ پاپاخ سے ملتی جلتی ہے ایک پر کا سفید پاجامہ سفید ململ کا انگرکھا اس پر ہلکے زرد زمین کی جامہ وار کا چغہ[2]۔ میری آہٹ پاکر لکھتے لکھتے آنکھ اونچی کی۔ میں نے آداب کیا۔ سلام کا جواب دیا اور آنکھوں سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ

---

[1] ۔ معلوم نہیں یہ کس زبان کا لفظ ہے۔ مگر دہلی میں عام طور پر شگوفے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

[2] قلعہ۔ دہلی کے عجائب خانہ میں مرزا غالب کی ایک تصویر ہے اس سے یہ لباس لیا گیا ہے۔

نواب ضیاء الدین خان آ گئے ۔ یہ امین الدین خاں صاحب نواب لوہارو کے بھائی ہیں ۔ بختہ ہیں رخشاں اور فارسی میں نیر تخلص کرتے ہیں ۔ کوئی چالیس سال کی عمر ہے ۔ انشا پردازی، جغرافیہ تاریخ علم انساب اسماء رجال تحقیق لغات اور واقفیت عامہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے ۔ مرزا نوشہ کے خلیفہ ہیں ۔ چھوٹا قد بہت گورا رنگ ۔ نازک نازک نقشہ ۔ غلافی آنکھیں بچی داڑھی ۔ چھریرا بدن غرض نہایت خوبصورت آدمی ہیں ۔ ایک برکا سفید پاجامہ اور سفید ہی انگرکھا زیب بدن تھے قالب چڑھی ہوئی چوگوشیہ ٹوپی سر پر تھی ایک بڑا رومال سمو سہ بنا کر کندھے پر ڈالے ہوئے تھے میں نے اٹھ کر سلام کیا انہوں نے بڑھ کر معانقہ کیا اور خاموش ایک طرف دوزانو نہایت ادب سے بیٹھ گئے تھوڑی دیر میں مرزا غالب بھی لکھنے سے فارغ ہوئے ۔ پہلے نواب صاحب کی طرف مڑے اور کہنے لگے ۔ میاں نیر تم کس وقت آ بیٹھے بھئی اس مرزا تفتہ نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے ظالم کی طبیعت کی روانی کسی طرح بھی کم نہیں ہوتی ۔ ہر خط میں آٹھ دس غزلیں اصلاح کے لئے بھیج دیتے ہیں ۔ اصلاح دیتے دیتے تھک جاتا ہوں ۔ میری طرف دیکھ کر کہا آپ شاید مولوی کریم الدین صاحب ہیں ۔ میں نے کہا "جی ہاں" فرمانے لگے ۔ حضرت آپ کے تشریف لانے کی مجھے پہلے ہی سے اطلاع مل گئی تھی ۔ کل ہی میاں عارف آکر مجھ سے ——— مشاعرے میں چلنے کا وعدہ لے گئے ہیں ۔ کہو میاں نیر تم بھی چلو گے نوابصاحب نے کہا جہاں آپ ہاں ہیں ۔ آپ تشریف لے جائیں گے تو انشاء اللہ میں بھی ضرور ہمراہ ہوں گا ۔ مرزا صاحب نے پوچھا ۔ مگر بھئی اب تک علائی نہیں آئے مجھ کو ان کا کل سے انتظار ہے ۔ اسے لو وہ آہی گئے عمر بڑی عمر ہے ۔ ابھی میں تم کو پوچھ رہا تھا ۔

نواب علاؤالدین خان علائی نواب لوہارو کے ولی عہد ہیں ۔ کوئی ۲۲،۲۳

سال کی عمر ہے ۔ متوسط قد، گندمی رنگ موٹا موٹا نقشہ ، گول چہرہ شربتی آنکھیں اور گھنی چڑھی ہوئی ڈاڑھی ہے لباس میں غلطے کا تنگ مہری پاجامہ سفید جامدانی کا انگرکھا اس پر سینہ کھلی ہوئی سیاہ مخمل کی نیم آستین اور سر پر سیاہ مخمل کی چوگوشیہ ٹوپی تھی وہ بھی آداب کرکے ایک طرف ایک طرف بیٹھ گئے اور کہا " واقعی آج دیر ہوگئی " مجھے خود خیال تھا کہ آپ انتظار کررہے ہوں گے میری طرف دیکھ کر کہا " آپ کی تعریف " مرزا نوشہ نے تمام قصہ بیان کیا اور کہا علائی تمکو بھی چلنا ہوگا ابھی تو شاید تم لوہارو نہیں جارہے ہو انہوں نے کہا " بہت خوب آپ تشریف لے جائیں گے تو میں بھی حاضر ہوں " جب یہ مرحلہ بھی طے ہوگیا تو میں نے اجازت چاہی وہاں سے رخصت ہوکر زین العابدین خاں کے مکان میں آیا ۔ انہوں نے مردانے کا ایک حصہ میرے لئے خالی کردیا ۔ جو اسباب صبح میں نے بھیجا تھا اسکو جا بجا پایا ۔ کپڑے اتارے اندر سے کھانا آیا ۔ کھانا کھاکر تھوڑی دیر سو رہا ۔ چار بجے کے قریب اٹھ کر حکیم مومن خاں کے ہاں جانے کی تیاری کی ۔

حکیم صاحب کا مکان چیلوں کے کوچہ میں ہے ۔ راستہ میں مولوی امام بخش صاحب صہبائی مل گئے ۔ یہ کالج میں میرے استاد رہے ہیں ۔ کھلا ہوا گندم گوں رنگ ہے منہ پر کہیں کہیں چیچک کے داغ ہیں ۔ سر پر پٹے ہیں بڑے دبلے پتلے آدمی ہیں ۔ کوئی چالیس سال کی عمر ہوگی ایک بر کا سفید پاجامہ ، سفید انگرکھا کشمیری کام کا جبہ پہنتے اور سر پر چھوٹا سفید صافہ باندھتے ہیں ۔ یہ بھی چیلوں کے کوچہ ہی میں رہتے ہیں ۔ مجھ سے پوچھنے لگے " کہاں جاتے ہو " میں نے کہا " حکیم مومن خاں کے پاس " پوچھا " کیا کام ہے " میں نے بیان کیا ۔ کہنے لگے " چلو میں بھی وہیں جارہا ہوں " ۔ حکیم آغا جان کے چھتے کے سامنے خان صاحب کا مکان تھا ۔ بڑا دروازہ ہے اندر بہت وسیع صحن اور اس کے چاروں طرف عمارت ہے دو طرفہ صحنچیاں ہیں اور سامنے بڑے دالان در دالان پچھلے دالان پہلے دالان کے اوپر کمرہ ہے ۔

سامنے کے دالان کی چھت کو کمرہ کا صحن کر دیا ہے لیکن منڈیر[1] بہت چھوٹی رکھی ہے۔ دالانوں میں چاندنی کا فرش ہے۔ اندر کے دالان میں بیچوں بیچ قالین بچھا ہوا قالین پر گاؤ تکیہ سے لگے حکیم صاحب بیٹھے ہیں۔ سامنے حکیم سکھانند المتخلص بہ رقم اور مرزا رحیم الدین حیا مؤدب دوزانو بیٹھے ہیں معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دربار لگا ہے کہ کسی کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے اور بلا ضرورت بولنے کا یارا نہیں۔ حکیم مومن خاں کی عمر تقریباً چالیس سال کی تھی۔ کشیدہ قامت۔ سرخ و سفید رنگ تھا۔ جس میں سبزی جھلکتی تھی۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں لمبی لمبی پلکیں کھنچی ہوئی بھویں۔ لمبی ستواں۔ پتلے پتلے ہونٹ ان پر پان کا لاکھا جما ہوا مسی آلودہ دانت۔ ہلکی ہلکی مونچھیں خشخاشی ڈاڑھی۔ بھرے بھرے ڈنٹر۔ پتلی کمر چوڑا سینہ اور لمبی انگلیاں سر پر گھونگھریالے لمبے لمبے بال کاکلوں کی شکل میں کچھ تو پشت پر اور کچھ کندھوں پر پڑے ہوئے تھے۔

کان کے قریب تھوڑے سے بالوں کو موڑ کر زلفیں بنا لیا تھا۔ بدن پر شربتی ململ کا نیچی چولی کا انگرکھا تھا۔ لیکن اس کے نیچے کرتہ نہ تھا۔ اور جسم کا کچھ حصہ انگرکھے کے پردے میں سے دکھائی دیتا تھا۔ گلے میں سیاہ رنگ کا فیتہ اس میں چھوٹا سا سنہری تعویذ۔ کاکریزی رنگ کے دوپٹہ کو بل دے کر کمر میں لپیٹ لیا تھا۔ اور اس کے دونوں کونے سامنے پڑے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں پتلا سا خار پشت پاؤں میں سرخ گلبدن کا پائجامہ مہریوں سے تنگ اوپر جا کر کسی قدر ڈھیلا۔ کبھی کبھی ایک برکا پائجامہ بھی پہنتے تھے۔ مگر کسی قسم کا بھی ریشمی اور قیمتی ہوتا تھا۔ چوڑا سرخ نیفہ انگرکھے آستینیں آگے سے کٹی ہوئی کبھی کھلی رہتی ہیں۔ اور کبھی الٹ کر چڑھا لیتے تھے

[1] میں نے خود یہ مکان ۲۰، ۲۲ برس ہوئے دیکھا تھا۔ ٹوٹ کر کھنڈر ہو گیا تھا ہر طرف کی عمارت ڈھے گئی تھی سامنے کا حصہ قائم تھا معلوم نہیں کہ اوپر کی منڈیر کیوں اتنی نیچی رکھی گئی تھی۔ اسی منڈیر سے حکیم مومن خاں نیچے گرے ہاتھ اور بازو ٹوٹ گیا اور اسی کی وجہ سے ان کا انتقال ہوا۔ خود ہی مرنے کی تاریخ کہی تھی: "دست و بازو بشکست" ۱۲۰۔

سر پر گلشن کی بڑی دو پلڑی ٹوپی اس کے کنارے پر باریک لیس۔ ٹوپی اتنی بڑی تھی کہ سر پر اچھی طرح منڈھ کر آگئی تھی۔ اندر سے مانگ اور ماتھے کا کچھ حصہ اور بال صاف جھلکتے تھے۔ غرض یہ کہ نہایت خوش پوش اور جامہ زیب آدمی تھے۔

جب میں اور مولانا صہبائی دونوں پہنچے تو صاحب عالم مرزا رحیم الدین حیا سے کہہ رہے تھے۔ کہ صاحب عالم! تمہارے شطرنج کے نقشوں نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ ایک ہو۔ دو ہوں آخر روز روز کی فرمائش کوئی کہاں تک پوری کرے" صاحب عالم نے کہا "استاد کیا کروں رزیڈنٹ کے پاس ولایت سے شطرنج کے نقشے حل کے لئے کو آیا کرتے ہیں۔ کچھ تو میں خود حل کر کے ان کے پاس بھیج دیتا ہوں۔ جو سمجھ میں نہیں آتے وہ آپ کے پاس لے آتا ہوں۔ حکیم صاحب نے نظر اٹھا کر ہماری طرف دیکھا۔ ہمارا سلام لے کر کہا "بیٹھیے، بیٹھیے" ہم بیٹھ گئے اور وہ پھر صاحب عالم کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے "میاں حیا! جو نقشہ تم لائے ہو وہ تو میرے خیال میں کچھ پیچیدہ نہیں ہے۔ تم کہتے ہو کہ سرخ مہروں کو مات ہوگی، میں کہتا ہوں نہیں سبز کو ہوگی۔ تم بساط بچھاؤ، میں ابھی سمجھائے دیتا ہوں اچھا پہلے ذرا مولوی صہبائی سے بات کر لوں اور میاں سکھانند! تم بیٹھے انتظار کرتے رہو۔ میں حکم لگا چکا ہوں کہ جب تک پورب کی طرف سے اس چھپکلی کا جوڑا نہ آجائے یہ سامنے کی دیوار سے نہ جائے گی۔ اس کا جوڑا آئے پھر گئے" سکھانند حکیم تھے۔ رقم تخلص کرتے تھے دھرم پورے میں رہتے تھے، کوئی ۴۰ سال کی عمر تھی۔ دیکھتے ہیں شاہ نصیر کے اور رہل میں خان صاحب کے شاگرد تھے بڑے خوش پوشاک، خوش وضع، خوش اخلاق، ظریف الطبع، حلیم، خوبصورت اور شکیل آدمی تھے۔ استاد کا ایسا ادب کرتے تھے جیسے کوئی بیٹا باپ کا کرتا ہے۔ حکیم صاحب کی باتیں سن کر "بہت خوب، مناسب" کہتے رہے۔ ان سے گفتگو کر کے

حکیم صاحب ہماری طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے "ارے بھئی صہبائی! تم تو کئی دن سے نہیں آئے۔ کہو خیریت تو ہے اور آپ کے ساتھ یہ کون صاحب ہیں" مولوی صہبائی نے کہا "یہ پہلے کالج میں میرے شاگرد تھے، اب مطبع کھول لیا ہے وہاں مشاعرہ کرنا چاہتے ہیں، آپ کو تکلیف دینے آئے ہیں" حکیم صاحب نے ہنس کر کہا "بس صاحب مجھے تو معاف ہی کیجیے۔ اب دہلی کے مشاعرے شریفوں کے جانے کے قابل نہیں رہے۔ ایک صاحب[1] ہیں وہ اپنی اُمت کو لے کر چڑھ آتے ہیں، شعر سمجھنے کی تو کسی کو تمیز نہیں، مفت میں واہ واہ! سبحان اللہ! سبحان اللہ! کا غل مچا کر طبیعت کو منغص کر دیتے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ ؎

صائب دو چیز می شکند قدر شعر را　　تحسینِ ناشناس و سکوتِ سخن شناس

دوسرے صاحب ہیں وہ کہ بہ کو ساتھ لئے پھرتے ہیں اور خواہ مخواہ استادوں پر حملہ کرتے ہیں۔ خود تو میدان میں نہیں آتے، اپنے نااہل پٹھوں کو مقابلے میں لاتے ہیں اس روز جو اس جانور نے یہ شعر پڑھ کر ؎

مرکزِ محورِ گردون بہ لبِ آب نہیں　　ناخنِ قوسِ قزح، شبہ، مضراب نہیں

کہا کہ یہ غالبؔ کے رنگ میں کہا ہے تو میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھ کو کس قدر ناگوار گزرا۔ غالبؔ کے رنگ میں شعر کہنا تو کجا وہ یا اُن کے استاد پہلے مرزا نوشہ کے شعروں کو سمجھ تو لیں۔ اب رہے میر صاحب[2] تو اُن کی بات دوسری ہے وہ بھی واہیات بکتے ہیں مگر کسی پر حملہ نہیں کرتے بلکہ ان کی وجہ سے مشاعرے میں چہل پہل ہو جاتی ہے۔ بھئی میں نے تو اسی وجہ سے مشاعروں میں جانا ہی ترک کر دیا ہے" میں نے عرض کی کہ "اس مشاعرے میں استاد ذوق اور مرزا نوشہ نے آنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ حضرت ظل سبحانی کی غزل بھی آئے گی" فرمایا "ہر شخص مختار ہے خود

---

[1] یہ استاد ذوق اور شہزادوں کی طرف اشارہ تھا ۱۲ [2] ان کا مفصل حال آگے آئے گا یہ بھی عجیب قسم تھے۔

آتے چاہے غزل بھیجیے، ہیں تو نہ آؤں گا نہ غزل بھیجوں گا " یہ باتیں ہی ہو رہی تھیں کہ ایک بنارس کا سوداگر کپڑوں کے دو گٹھے لے کر آیا۔ شہر میں جب کوئی کپڑوں کا سوداگر آتا تو حکیم صاحب کے پاس اس کا آنا لازمی تھا۔ ریشمی کپڑوں سے ان کو عشق تھا۔ کوئی کپڑا پسند آتا تو پھر قیمت کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ جو مانگتا دیتے۔ اس سوداگر نے آکر ایک گٹھری مزدور کے سر پر سے اتاری۔ اس میں سے پٹ سے ایک چھپکلی نیچے گری اور دوڑ کر سامنے کی دیوار پر جو بھی بیٹھی تھی وہ لپک کر اس سے آملی اور دونوں مل کر ایک طرف چلی گئیں[۱]۔ ہم لوگ بیٹھے یہ تماشا دیکھتے رہے۔ جب دونوں چھپکلیاں چلی گئیں تو حکیم صاحب نے کہا "کہو میاں رحیم تم نے دیکھا" انھوں نے کہا "جی ہاں ایک خانے کے حساب لگانے میں مجھ سے غلطی ہوئی میں نے جو اپنی رائے پر اصرار کیا تھا۔ اس کی معافی چاہتا ہوں" کہنے لگے "بھئی انسان ہی سے تو غلطی ہوتی ہے ہاں تو بھئی مہابائی مشاعرے کے متعلق ہما الفصاف جواب ہے" میں نے جب دیکھا کہ خاں صاحب ہاتھوں سے نکلے ہی جا رہے ہیں تو مجھے نواب زین العابدین خاں کا آخری نسخہ یاد آیا۔ میں نے کہا "مجھے تو اس شاعرے سے برائے نام تعلق ہے، سب کیا دھرا نواب زین العابدین خاں عارف کا ہے۔ وہ بہت بیمار ہو گئے ہیں اور ان کو اب زندگی کی امید نہیں رہی۔ ان کی آخری خواہش ہے کہ مرتے مرتے ایک ایسا مشاعرہ دیکھ لوں جس میں دہلی کے تمام کاملین فن جمع ہوں۔ وہ خود حاضر ہوتے مگر حکیم احسن اللہ خاں صاحب نے ان کو کہیں آنے جانے سے منع کر دیا ہے" یہ آخری فقرہ میں نے اپنی طرف سے بڑھا دیا۔ خاں صاحب بڑے غور سے میری بات سنتے رہے میں خاموش ہوا تو مولوی امام بخش

---

[۱] یہ واقعہ ہے اس کے دیکھنے والے ایک صاحب کا ابھی کوئی بیس برس ہوئے انتقال ہوا ہے میں نے یہ واقعہ خود ان کی زبانی سنا ہے ۱۲۔

صاحب کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے "افسوس ہے، کیا خوش فکر اور ذہین شخص ہے۔ یہ عمر اور یہ مایوسی، سچ ہے، ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔" میری طرف دیکھ کر کہا "اچھا بھئی تم جاؤ، میری طرف سے عاشق سے کہہ دینا کہ میاں ہم ضرور آؤں گا۔" جب میں نے دیکھا کہ یہ جادو چل گیا تو اور پاؤں پھیلائے اور کہا "نواب صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ مولوی صہبائی صاحب، مفتی صدرالدین صاحب اور نواب مصطفےٰ خاں صاحب شیفتہ کو بھی اپنے ہمراہ لیتے آئیں گا تو عنایت ہوگی۔" حکیم صاحب کہنے لگے "میاں صہبائی سے تو میں ابھی کہے دیتا ہوں، اب رہے آزردہ اور شیفتہ تو واپس جاتے جاتے ان سے بھی کہتے جاؤ۔ یہ کہہ دینا کہ میں نے تم کو بھیجا ہے، ہاں تاریخ کیا مقرر کی ہے، مشاعرہ کہاں ہوگا اور "طرح" کیا ہے؟" میں نے تاریخ بتا کر مکان کا پتہ دیا۔ "طرح" کے متعلق حضرت جہاں پناہ کے حضور میں جو گفتگو ہوئی تھی وہ بیان کی۔ کہنے لگے "ہمارے بادشاہ سلامت بھی عجیب چیز ہیں جو سوجھتی ہے نئی سوجھتی ہے۔ شاید ایسا مشاعرہ کہیں بھی نہ ہوا ہوگا جس میں "طرح" نہ دی گئی ہو۔ خیر یہ تو اچھا ہی تھا جھگڑے کا جو پڑا ہی نہیں رہا مگر بھئی بات یہ ہے کہ جب تک مقابلے کی صورت نہ ہو نہ شعر کہنے میں جی لگتا ہے اور نہ پڑھنے میں لطف آتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ کپڑے دیکھنے میں مشغول ہو گئے اور میں سلام کر کے رخصت ہوا۔ چتلی قبر کے قریب حویلی عزیز آبادی کے سامنے مفتی صدرالدین صاحب کا مکان تھا اس کے نزدیک مٹیا محل میں نواب مصطفےٰ خاں صاحب شیفتہ رہتے ہیں مفتی صاحب کے ہاں جا کر معلوم ہوا کہ شیفتہ بھی مفتی صاحب ہی کے پاس بیٹھے ہیں میں نے کہا چلو، اس سے بہتر موقع ملنا مشکل ہے، دونوں سے ایک ہی جگہ ملنا ہو گیا۔ یہ سوچ کر اندر گیا۔ مکان کوٹھی کے نمونے کا ہے، انگریزی اور ہندوستانی دونوں وضع کو ملا کر بنایا گیا ہے۔ صحن بہت بڑا نہیں ہے۔ اس میں مختصر سی نہر

ہے۔ سامنے دالان دردالان اور پہلو میں انگریزی وضع کے کمرے ہیں۔ باہر کے دالان میں کواڑ لگا کر اس کو بھی کمرے کی شکل کا کر دیا ہے۔ دالانوں کے سامنے اونچا چبوترہ ہے۔ چبوترے کے اوپر تخت بچھے ہوئے تھے، اس پر چاندنی کا فرش اور دو طرف گاؤ تکئے لگے ہوتے تھے۔ تختوں پر مفتی صاحب اور نواب صاحب بیٹھے باتیں کر رہے تھے مفتی صاحب کی عمر کوئی ۶۵، ۷۰ سال کی تھی۔ گداز جسم، سانولا رنگ چھوٹی چھوٹی آنکھیں ذرا اندر کو دھنسی ہوئیں، بھری ہوئی ڈاڑھی، بہت سیدھی سادی وضع کے آدمی ہیں۔ ظاہری نمائش سے کوئی سروکار نہیں۔ لباس سفید ایک پرکا پاجامہ، سفید کرتہ اور سفید ہی صافہ تھا۔ جامہ زیبی میں حکیم مومن خاں کے بعد دہلی میں نواب مصطفےٰ خان شیفتہ ہی کا نمبر تھا۔ ان کا رنگ گہرا سانولا تھا لیکن ناک نقشہ غضب کا پایا تھا۔ اس پر نیچی سیاہ گول ڈاڑھی بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ جسم کسی قدر بھاری اور قد متوسط تھا۔ لباس میں بھی زیادہ تکلف نہیں کرتے تھے۔ تنگ مُہری کا سفید پاجامہ سفید کرتہ، نیچی چولی کا سفید انگرکھا اور قبلہ نما پچگوشیہ ٹوپی پہنتے تھے۔ تقریباً ۳۹، ۴۰ سال کی عمر تھی۔

میں آداب کر کے تخت کے ایک کونے پر دو زانو بیٹھ گیا۔ مفتی صاحب نے

لہ پرانے زمانے میں شرفا گھر پر بھی پورا لباس پہنے رہتے تھے۔ زنانے میں جانے کے خاص خاص وقت تھے ورنہ سارا وقت مردانے ہی میں گزرتا تھا ہر وقت کوئی نہ کوئی ملنے جلنے والا پاس بیٹھا رہتا۔ عالم ہوئے تو درس کا حلقہ ہوتا شاعر ہوئے تو شعر کا چرچا رہتا۔ غرض کوئی وقت بیکار نہ گزرتا۔ خاص خاص دوستوں سے مذاق کی گفتگو ہوتی ورنہ عام طور پر اپنے کو بہت لئے دیئے رہتے جہاں جاؤ یہی معلوم ہوتا کہ دربار لگا ہوا ہے۔ ہر شخص دو زانو مؤدب بیٹھا ہے بے ضرورت نہ بات کی جاتی ہے نہ جواب دیا جاتا ہے کوئی ہنسی کی بات ہوئی تو ذرا مسکرا دیئے بس کھلا کر ہنسنا معیوب اور بڑھ بڑھ کر بولنا یا اونچی آواز میں بات کرنا خلاف ادب سمجھا جاتا تھا۔

آنے کا سبب پوچھا۔ میں نے حکیم مومن خاں کا پیام پہنچادیا۔ مفتی صاحب نے بڑے تعجب سے پوچھا "ہیں! خاں صاحب نے مشاعرے میں نہ جانے کا عہد کرلیا ہے بھئی شیفتہ! یہ کیا معاملہ ہے؟ یا تو خود نہیں جاتے تھے یا دوسروں کو بھی ساتھ گھسیٹ رہے ہیں" میں نے نواب زین العابدین عارف کا واقعہ بیان کیا کہنے لگے "ہاں، یوں کہو، یہ بات ہے۔ ورنہ مجھے تو یہ سن کر حیرت ہوئی تھی کہ حکیم صاحب اور مشاعرے میں جائیں، اچھا بھئی عارف سے کہہ دینا کہ میں اور شیفتہ دونوں آئیں گے"۔ یہاں سے چھٹی ہوئی تو میں سمجھا کہ گویا گنگا نہالیا۔ خوشی خوشی آکر نواب زین العابدین خاں سے واقعہ بیان کیا۔ وہ بھی مطمئن ہو گئے۔ میں نے حکیم مومن خاں کا جب حال بیان کیا تو ان کے آنسو نکل آئے۔ کہنے لگے "میاں کریم الدین! تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ میری حکیم صاحب سے صفائی نہیں ہے"۔ میں نے کہا "نواب صاحب! آپ کیا فرماتے ہیں ان پر تو آپ کی بیماری سننے کا ایسا اثر ہوا کہ بیان نہیں کرسکتا۔ شاید ان کا سگا بھائی بھی ہوتا تو اتنا ہی اثر ہوتا۔ مفتی صاحب سے معلوم ہوا کہ انھوں نے مشاعروں میں نہ جانے کا عہد کرلیا تھا صرف آپ کی وجہ سے انھوں نے یہ عہد توڑا ہے"۔ نواب صاحب نے کہا "بھئی، تم کو ان لوگوں کی محبتوں کا کیا حال معلوم! یہ لوگ وہ ہیں کہ اپنے دشمن کو بھی مصیبت میں نہیں دیکھ سکتے۔ خیر اس کو جانے دو اب یہ بتاؤ کہ تمہارا مکان خالی ہو گیا یا نہیں"۔ میں نے کہا "جی ہاں بالکل خالی ہے۔ حکم ہو تو میں بھی خدمت میں حاضر رہ کر مدد کروں"۔ فرمایا "نہیں بھئی، نہیں جہاں دو آدمیوں نے مل کر کسی کام میں ہاتھ ڈالا اور وہ خراب ہوا۔ تم اس انتظام کو بس مجھ پر چھوڑ دو میں جانوں اور میرا کام جانے۔ بلکہ تم تو ادھر آنا بھی نہیں۔ تم نے آکر اگر مین میخ نکالی تو مجھ پر دوہری تہری محنت پڑ جائے گی"۔

۳۔ ترتیب

بشعر و سخن مجلس آراستند   نشستند و گفتند و برخاستند

میں تاریخ ابو الفداء کے ترجمے میں ایسا گمتہ گیا کہ ۷، ۸ روز تک گھر سے باہر نہ نکلا۔ نواب زین العابدین خاں کے شوق کی یہ حالت تھی کہ باوجود کمزوری و نقاہت کے روز صبح ہی سے جو باہر نکلتے تو کہیں رات کے آٹھ نو بجے جا کر ان کی صورت گھر میں دکھائی دیتی۔ اس لئے ان سے ملنا نہیں ہوا کہ کچھ حال پوچھتا۔ بہرحال یہ آٹھ دن آنکھ بند کرتے گزر گئے اور مشاعرے کی تاریخ آ ہی گئی۔ ۱۴ رجب کو شام کے ساڑھے سات بجے کے قریب میں بھی مشاعرے میں جانے کو تیار ہؤا۔ نواب صاحب کو دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ صبح سے جو گئے ہیں تو اب تک واپس نہیں آئے۔ گھر سے جو نکلا تو بازار میں بڑی چہل پہل دیکھی۔ ہر شخص کی زبان پہ مشاعرے کا ذکر تھا کوئی کہتا تھا کہ یہ میاں کریم الدین کون ہیں کوئی کہتا کہ بھئی کوئی ہوں مگر انتظام ایسا کیا ہے کہ دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے۔ میں یہ باتیں سنتا اور دل میں خوش ہوتا ہوا قاضی کے حوض پہ آیا، کیا دیکھتا ہوں کہ سڑک کے دونوں جانب ٹٹیاں لگا کر اور ان میں روشنی کے گلاس جا کر رات کو دن کر دیا ہے۔ سڑک پر خوب چھڑکاؤ ہے، کٹورا بج رہا ہے۔ مبارک النساء بیگم کی حویلی کے بڑے پھاٹک کو گلاسوں، قمقموں اور قندیلوں سے سجا کر گلزار آتشیں کر دیا ہے۔ صدر دروازے سے اندر کی دہلیز تک روشنی کا یہ عالم ہے کہ آنکھوں میں چکا چوند آتی ہے۔ مکان کے اندر جو قدم رکھا تو ہوش جاتے رہے یا اللہ یہ میرا ہی مکان ہے یا کسی شاہی محل میں آگیا ہوں۔

گھڑی گھڑی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھتا اور کہتا: "واہ میاں عارف واہ! تم نے تو کمال کر دیا! کہاں وہ بچارے کریم الدین کا مکان اور کہاں یہ بادشاہی ٹھاٹھ واقعی تمہارا کہنا صحیح تھا کہ اگر دو ہزار میں بھی کام نکل جائے تو یہ سمجھو کہ کچھ نہیں اٹھا۔" چونے میں ابرک ملا کر مکان میں قلعی کی گئی تھی جس کی وجہ سے در و دیوار بڑے جگ مگ، جگ مگ کر رہے تھے۔ صحن کو بھر کر تختوں کے چوکے اس طرح بچھائے تھے کہ چبوترہ اور صحن برابر ہو گئے تھے۔ تختوں پر دری، چاندنی کا فرش، اس پہ قالینوں کا حاشیہ، پیچھے گاؤ تکیوں کی قطار، جھاڑوں، فانوسوں، ہانڈیوں، دیوار گیریوں، قمقموں، چینی قندیلوں اور گلاسوں کی وہ بہتات تھی کہ تمام مکان بقعۂ نور بن گیا تھا۔ جو چیز تھی خوبصورت اور جو شے تھی قرینے سے، سامنے کی صف کے بیچوں بیچ چھوٹا سا سبز[1] مخمل کا کارچوبی شامیانہ، گنگا جمنی چوبوں پر سبز ہی ریشمی طنابوں سے استادہ تھا۔ اس کے نیچے سبز مخمل کی کارچوبی مسند پیچھے سبز کارچوبی گاؤ تکیہ، چاروں چوبوں پہ چھوٹے چھوٹے آٹھ چاندی کے فانوس نصب تھے۔ فانوسوں کے کنول بھی سبز چوبوں کے سنہری کلسوں سے لگا کر نیچے تک موٹے موٹے موتیا کے گجرے سہرے کی طرح لٹکے ہوئے بیچ کی لڑیوں کو سمیٹ کر کلا بتونی ڈوریوں سے جس کے کونوں پہ مقیش کے گچھے تھے۔ اس طرح چوبوں پر کس دیا گیا تھا کہ شامیانے کے چاروں طرف پھولوں کے دروازے بن گئے تھے۔ دیواروں میں جہاں کھونٹیاں تھیں۔ وہاں کھونٹیوں پر اور جہاں کھونٹیاں نہیں تھیں وہاں کیلیں گاڑ کر پھولوں کے ہار لٹکا دیئے تھے۔ اس سرے سے لگا کر اس سرے تک سفید چھت گیری جس کے حاشیے سبز تھے، کھنچی ہوئی تھی، چھت گیری کے بیچوں بیچ موتیا

---

[1] سبز رنگ دہلی کا شاہی رنگ تھا ۱۲

کے ہار لٹکا کر لڑیوں کو چاروں طرف اس طرح کھینچ دیا گیا تھا کہ پھولوں کی چھتری بن گئی تھی۔ ایک صحنچی میں پانی کا انتظام تھا، کورے کورے گھڑے رکھے تھے اور شورے میں جست کی صراحیاں لگی ہوئی تھیں، دوسری صحنچی میں پان بن رہے تھے۔ باورچی خانے میں حقوں کا تمام سامان سلیقے سے جما ہُوا تھا، جا بجا نوکر صاف ستھرے لباس پہنے دست بستہ مودّب کھڑے تھے۔ تمام مکان مشک، عنبر اور اگر کی خوشبو سے بڑا مہکسر رہا تھا۔ قالینوں کے سامنے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر حقوں کی قطار تھی حقے ایسے صاف ستھرے تھے کہ معلوم ہوتا تھا۔ ابھی دکان پر سے خرید ہو کر آئے ہیں۔ حقوں کے بیچ میں جو کچھ جگہ چھوٹ گئی تھی وہاں چھوٹی چھوٹی تپائیاں رکھ کر اُن پر خاصدان رکھ دیئے تھے۔ خاصدانوں میں لال تندیل کی صافیوں میں لپٹے ہوئے پان، گلوریوں کو صافی میں اس طرح جمایا تھا کہ بیچ میں ایک ایک ننہ پھولوں کی آ گئی تھی۔ خاصدانوں کے برابر چھوٹی چھوٹی کشتیاں، ان میں الائچیاں، چکنی ڈلیاں اور بن دھنیا۔ مسند کے سامنے چاندی کے دو شمعدان، اندر کافوری تبیاں۔ اوپر ہلکے سبز رنگ کے چھوٹے کنول، شمعدانوں کے نیچے چاندی کے چھوٹے لگن، لگنوں میں عرق کیوڑہ، غرض کیا کہوں ایک عجیب تماشا تھا۔ میں تو الف لیلیٰ کا ابوالحسن ہو گیا۔ جدھر نظر جاتی اُدھر ہی کی ہو رہتی۔ میں اس تماشے میں محو تھا کہ لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہُوا۔

سب سے پہلے مرزا کریم الدین رَسا آئے۔ یہ سلاطین زادے ہیں۔ کوئی ستر برس کے پیٹے میں ہیں۔ استعداد علمی تو کم ہے۔ مگر شاعری میں اپنے برابر کسی کو

---

[1] بزرگوں کی زبانی دیوان عام کے مشاعروں کا جو حال میں نے سُنا ہے بجنسہٖ اس پر مشاعرے کا نقشہ قائم کیا ۱۲۔

نہیں سمجھتے، بہت رحم دل، خوش خلق اور سادہ مزاج ہیں۔ دغل فصل نام کو نہیں ہے ملاح کہا کرتے ہیں کہ کشتی میں "چڑھے سب سے پہلے اور اُترے سب سے پیچھے" انہوں نے اس مقولہ کو مشاعرے سے متعلق کر دیا ہے۔ مشاعرے میں سب سے پہلے آتے ہیں۔ اور جب تک ایک ایک کر کے سب نہیں چلے جاتے یہ اُٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ مشاعرہ ہو رہا تھا۔ بڑے زور سے ابر آیا۔ سب نے جلدی جلدی مشاعرہ ختم کیا۔ لوگ اپنے اپنے گھر گئے لیکن یہ ٹھہرے اپنی وضع کے پابند، جب تک سب نہ جا چکے اپنی جگہ سے نہ اُٹھے۔ ہاں گھڑی گھڑی جھک جھک کر آسمان دیکھ لیتے تھے۔ اتنے میں موسلا دھار مینہ برسنا شروع ہوا۔ ایسا برسا کہ جل تھل بھر گئے۔ کہیں دو گھنٹے کے بعد خدا خدا کر کے ذرا مینہ تھما تو یہ بھی اُٹھے مگر ایسا اندھیر اگھپ تھا کہ ہاتھوں کو ہاتھ نہیں سوجھتا تھا۔ مالک مکان نے ایک نوکر قندیل دے کر ساتھ کر دیا۔ گلیوں میں ٹخنوں ٹخنوں پانی تھا۔ ان بچارے کے پاؤں میں زردوزی کا قیمتی جوتا، کیچڑ میں پاؤں رکھیں تو کیسے رکھیں آخر چپکے سے نوکر سے کہا تو اپنا جوتا مجھے دیدے۔ اس کا جوتا کیا تھا۔ لیتھڑے تھے وہی گھسیٹتے ہوئے چلے اپنا جوتا بغل میں دبا لیا۔ قلعہ پہنچ کر ایک نیا جوتا نوکر کو دیا اور کہا: "میاں تونے آج میرے ساتھ ایسا احسان کیا ہے کہ تمام عمر نہ بھولوں گا۔ جب کبھی تجھے کوئی ضرورت ہو تو میرے پاس آجایا کیجیو۔" آگے چل کر اس بدمعاش نے ان کو بہت دق کیا۔ اوّل تو اس ہدایت کا ڈھنڈورا پیٹ دیا۔ دوسرے ہر تیسرے چوتھے ان سے ایک دو روپے مار لاتا۔ مگر انہوں نے کبھی "نا" نہیں کی، جب جاتا کچھ نہ کچھ سلوک ضرور کرتے۔

نواب زین العابدین خاں صاحب نے بڑھ کر لب فرش ان کو لیا اور پوچھا "ہیں صاحب عالم! میاں صہبائی آپ کے ساتھ نہیں آئے۔" مرزا رحیم الدین حیا،

ان کے بڑے بیٹے ہیں لیکن تھوڑے دنوں سے باپ بیٹے میں کچھ صفائی نہیں رہی ہے۔ نواب صاحب کا اتنا کہنا تھا کہ صاحب عالم ناسور کی طرح پھوٹ بہے، کہنے لگے۔

"نواب! وہ بھلا میرے ساتھ کیوں آتے۔ جب سے بنارس ہو کر آئے ہیں ان کا تو رنگ ہی بدل گیا۔ میں بچارہ تو کس گنتی میں ہوں وہ کسی کو بھی اب خاطر میں نہیں لاتے، پالا، پوسا، بڑا کیا، پڑھایا، لکھایا، شاعر بنایا، بٹیریں لڑانا سکھایا اور تختؔ[1] کی قسم وہ وہ نسخے بٹیروں کے بتائے ہیں کہ قلعہ تو قلعہ ہندوستان بھر میں کسی کے فرشتہ خاں کو بھی معلوم نہ ہوں گے اور اب وہی صاحبزادے صاحب ہیں کہ استاد ماننا تو در کنار مجھ کو باپ بھی کہتے شرماتے ہیں۔ ہاں بھئی کیوں نہ ہو۔ تیرھویں صدی ہے۔ ان کو بنارس بھیج کر میں تو مصیبت میں آگیا۔" ایک نقصان مایہ دوسرے شماتت ہمسایہ۔ "بیٹا ہاتھ سے گیا تو گیا، دن رات کی دانتا کلکل اور مول لے لی۔" یہ باتیں کرتے کرتے نواب صاحب نے میاں رسا کو لے جا کر ایک جگہ بٹھا دیا۔ ابھی ان سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ شہزادوں کا ایک گروہ حافظ عبدالرحمٰن احسانؔ کو جھرمٹ میں لئے آ پہنچا۔ بھلا دلی شہر میں کون ہے جو حافظ جیو کو نہ جانتا ہو، جگت استاد ہیں، پہلے تو قلعے کا قلعہ ان کا شاگرد تھا۔ مگر استاد ذوقؔ کے قلعے میں قدم رکھتے ہی ان کا زور خود اٹوٹا۔ یہ بھی زمانے کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے اور شاہ نصیر سے ٹکر لڑا چکے تھے، اس بڑھاپے میں بھی خم ٹھونک

---

[1] روز روز کی خانہ جنگیوں نے ہر شہزادے کے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا تھا کہ شاید کل میں ہی بادشاہ ہو جاؤں اس لئے قلعہ کے سب لوگ خواہ وہ شہزادے ہوں یا سلاطین زادے ہمیشہ تخت کی تاج کی اور اسی طرح کی قسمیں کھایا کرتے تھے ۱۲

کر سامنے آگئے اور مرتے دم تک مقابلے سے نہ ہٹنا تھا نہ ہٹے، کوئی ۹۰ برس کی عمر تھی، کمر دُہری ہونے سے قد کمان بن گیا تھا۔ اپنے زمانے کے "ملعم باعور" تھے لیکن غزل اس کڑاکے سے پڑھتے تھے کہ تمام مشاعرے پر چھا جاتے تھے ان کی استادی کا سکہ زمانے سے تمام دلّی پر بیٹھا ہُوا تھا۔ پہلے مرزا تیلی کے اُستاد ہوئے، رفتہ رفتہ شاہ عالم بادشاہ غازی نور اللہ مرقدہٗ تک رسائی ہوگئی۔ وہ ان کو "حافظ جیو" کہتے تھے۔ اس لئے اسی نام سے تمام قلعے میں مشہور تھے مصرعے پر مصرعہ لگانے میں کمال تھا اور سند ایسے تڑاخ سے دیتے تھے کہ معترض منہ دیکھتے رہ جاتے تھے ایک روز بادشاہ سلامت نے مصرعہ کہا ؎

"صبح بھی بوسہ تو دیتا تجھے اے ماہ نہیں"

انہوں نے فوراً عرض کی۔

"نامناسب ہے میاں وقت سحر گاہ نہیں"

کسی نے "وقتِ سحر گاہ" کی ترکیب پر اعتراض کیا۔ انہوں نے صاحب صاحب کا یہ شعر پڑھا۔

آدمی پیر چو شد حرص جواں می گردد خواب در وقتِ سحر گاہ گراں می گردد

اور معترض صاحب اپنا سا مُنہ لے کر رہ گئے۔

بڑے دُبلے پتلے آدمی تھے، رنگ بہت کالا تھا شاہ نصیر نے اسی رنگ کا خاکہ اس طرح اُڑایا ہے ؎

اے خالِ رخ یار تجھے ٹھیک بناتا جا چھوڑ دیا حافظِ قرآن سمجھ کر

نواب صاحب نے اُن سب کو بھی ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنی اپنی جگہ لا کر بٹھا دیا ابھی ان کو بٹھانے سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ منشی محمد علی تشنہ چم ننگے، نشے میں چور، جھومتے جھامتے اندر آئے۔ نوجوان آدمی مگر عجب حال ہے کبھی برہنہ

پڑے پھرتے ہیں۔ کبھی کپڑے پہن خاصے بھلے آدمی بن جاتے ہیں۔ کسی کے شاگرد نہیں اور پھر سب کے شاگرد ہیں۔ کبھی حکیم آغا خان عیش سے اصلاح لینے لگتے ہیں۔ کبھی استاد ذوق کے پاس اصلاح کے لئے غزل لے آتے ہیں۔ ذہن بلا کا پایا ہے لاکھوں شعر زبان کی نوک پر ہیں، شعر سُنا اور یاد ہوا۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی کی غزل سُنی اور یاد کر لی اور مشاعرے میں خود اپنے نام سے وہ غزل پڑھ ڈالی اور وہ بیچارہ منہ دیکھتا رہ گیا۔ نواب صاحب آگے بڑھے، پوچھا "منشی جی یہ کیا رنگ ہے" کہنے لگے "اصلی رنگ، مشاعرہ کب شروع ہوتا ہے؟ نواب صاحب نے کہا: ابھی شروع ہوتا ہے آپ بیٹھئے تو سہی خیر ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئے۔ میاں عارف نے ان پر ایک دوشالا لا کر ڈال دیا۔ انہوں نے اُٹھا کر پھینک دیا۔ غرض جس طرح ننگے آئے تھے اسی طرح بلا تکلف بیٹھے رہے۔ اس کے بعد تو لوگوں کے آنے کا تانتا بندھ گیا۔ جو آتا اس کا استقبال نواب صاحب کرتے اور لا لا کر بٹھاتے۔ حکیم مومن خاں آئے ان کے ساتھ آزردہ، شیفتہ، صہبائی اور مولوی مملوک العلی تھے مولوی صاحب مدرسۂ دہلی میں مدرس اول ہیں۔ عجیب باکمال آدمی ہیں۔ مدرسے میں ان کی ذات بابرکات سے وہ فیض ہوا ہے کہ شاید ہی کسی زمانے میں کسی اُستاد سے ہوا ہو۔ بہت پابند شرع ہیں، اس لئے خود شعر نہیں کہتے مگر سمجھتے ایسا ہیں کہ ان کا کسی شعر کی تعریف گویا اس کو دوام کی سند دینا ہے۔ کوئی ۴۰ سال کا سن ہے رہنے والے تو نانوتے کے ہیں مگر مدتوں سے دہلی میں آ رہے ہیں۔ دن رات پڑھنے پڑھانے سے کام ہے۔ مشاعروں میں کم جاتے ہیں۔ یہاں شاید مولانا صہبائی ان کو اپنے ساتھ گھسیٹ لائے۔ تھوڑے ہی دن ہوئے بچارے پابندی شرع اور تقویٰ کی وجہ سے چکر میں آ گئے تھے۔ ہوا یہ کہ ریذیڈنٹ بہادر مدرسے معائنہ کو آئے۔ ان کے علم اور رتبے کے خیال سے ہاتھ ملایا جب تک صاحب بہادر

دہاں رہے انہوں نے ہاتھ کو جسم سے اس طرح الگ رکھا جیسے کوئی نجس چیز کو دُور رکھتا ہے۔ صاحب کے جاتے ہی بہت احتیاط سے ہاتھ کئی بار دھویا۔ کسی نے جاکر صاحب سے یہ بات لگادی، اُن کو بہت غصّہ آیا کہ ہم نے تو ہاتھ ملاکر ان کی عزت افزائی کی۔ انہوں نے اس طرح ہماری توہین کی۔ غرض بڑی مشکل سے یہ معاملہ رفع دفع ہوا۔

مولوی صاحب میرے بھی اُستاد تھے۔ میں بھی آگے بڑھا۔ آداب کیا فرمانے لگے "میاں کریم الدین میں تم کو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ تم نے تو دہلی والوں کو مات کر دیا۔ سبحان اللہ سبحان اللہ! کیا انتظام ہے، دیکھ کر دل خوش ہوگیا، خدا تمہیں اس سے زیادہ حوصلہ دے۔" میں نے عرض کی: "مولوی صاحب بھلا میں کیا۔ اور میری بساط کیا۔ یہ سب کیا دھرا نواب زین العابدین خاں کا ہے"، فرمانے لگے "بھئی یہ بھی اچھی ہوئی وہ کہیں کہ سارا انتظام کریم الدین خاں کا ہے، تم کہو کہ نواب صاحب کا ہے۔ چلو "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو"۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ مرزا نوشہ پالکی میں سے اُترے نیّر، علائی، سالک اور حزیں ان کے ہمراہ تھے۔ مرزا غالب مومن خاں کی طرف بڑھے، مصافحہ کیا اور کہا: "بھئی حکیم صاحب آج محمد قاسم خاں مرزوں کا عظیم آباد سے خط آیا تھا۔ تم کو بہت بہت سلام لکھا ہے، معلوم نہیں کہ کیوں ایکا ایکی پٹنہ چلے گئے۔ خواجہ میر درد کے پوتے ہو کر ان کا دہلی کو چھوڑنا ہم کو تو پسند نہیں آیا، اب یاروں کو روتے ہیں۔ دیکھنا کیا درد بھرا شعر لکھا ہے

نہ تو نامہ ہے نہ پیغام زبانی آیا — آہ مرزوں تجھے یارانِ وطن بھول گئے

ارے بھئی رات تو خاصی آگئی ہے، ابھی تک میاں ابراہیم نہیں آئے آخر یہ مشاعرہ شروع کب ہوگا۔" حکیم صاحب کچھ جواب دینے ہی والے تھے کہ دروازے کے پاس "السلام علیکم" کی آواز آئی مولانا صہبائی نے کہا: "لے لیجئے مرزا صاحب

وہ اُستاد کے نشان کے ہاتھی حافظ ویراں صاحب آگئے اور وہ آپ کے دوست ہُدہُد بھی ساتھ ہیں، دیکھئے آج کس کے جو پنج مارتے ہیں" میاں ہُدہُد کا نام عبدالرحمٰن ہے پورپ کے رہنے والے ہیں، دِلّی میں آکر حکیم آغا خاں عیش کے ہاں ٹھہر گئے ہیں۔ ان کے بچوں کو پڑھاتے ہیں۔ حکیم صاحب ہی کے مشورے سے ہُدہُد تخلص اختیار کیا۔ ان ہی کی تجویز سے چنگی ڈاڑھی رکھی۔ سر منڈا کر نکو عمامہ باندھا اور اس طرح خاصے کھٹ بڑھئی ہو گئے۔ ان ہی کے ذریعے سے دربار میں پہنچے اور "طائرالاراکین شہپرالملک ہُدہُدالشعرا منقار جنگ بہادر" خطابات پائے۔ شروع شروع میں تو ان کے ظریفانہ کلام سے مشاعرہ چمک جاتا تھا۔ مگر بعد میں انہوں نے اُستادانِ فن پر حملے شروع کر دیئے کہتے تو یہ ہیں کہ حکیم صاحب کے اشارہ سے ایسا کیا۔ لیکن کچھ بھی ہو، آخر آخر سب کو ان سے کچھ نفرت سی ہو گئی۔ اور بجائے دوسروں کا مذاق اُڑنے کے خود اُن کا مذاق اُڑ جاتا تھا۔ حکیم صاحب علانیہ تو اُن کی مدد کر نہیں سکتے تھے خود ان میں اتنی قابلیت نہ تھی جو دِلّی والوں کی پھبتیوں کو سنبھال سکتے۔ اس لئے تھوڑی ہی دیر میں ٹھنڈے ہو کر رہ جاتے۔ مرزا نوشہ اور حکیم مومن خاں پر ہمیشہ منہ آتے تھے۔ اسی لئے مرزا نوشہ مولانا صہبائی کے منہ سے "آپکے دوست" کا لفظ سن کر مسکرائے اور کہا "بھئی میں تو اُن کے منہ کیوں لگنے لگا مگر آج دیکھا جائے گا۔ "ہر فرعونے را موسیٰ" سنتا ہوں کہ ہمارے میر صاحب مولوی ہُدہُد کی شان میں آج کچھ فرمانے والے ہیں۔ ان کے سامنے اگر یہ "شہبازِ سخن" ٹک گئے تو میں سمجھوں گا کہ بڑا کام کیا" غرض یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اُستاد ذوق بھی اندر آگئے۔ تمام قلعہ ان کے ساتھ آیا تھا صاحب سلامت کر کے سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ قلعہ والوں اور اُن لوگوں میں جن کا تعلق قلعہ سے ہے۔ سلام کرنے کا کچھ عجیب طریقہ ہے۔ سیدھے کھڑے ہو کر دایاں ہاتھ اس طرح کان تک لے جاتے ہیں جس طرح

کوئی نماز کی نیت باندھتا ہے اور پھر چھوڑ دیتے ہیں، چلو سلام ہو گیا۔ باقی سب لوگوں سے معمولی طرح سلام کرتے ہیں۔ قلعہ والوں کی صورت کچھ ایسی ہے کہ ایک ہی نظر میں پہچان لئے جاتے ہیں۔ شہزادے ہوں یا سلاطین زادے سب کی وضع قطع ایک سی ہے۔ وہی لمبی گردن، وہی پتلی اونچی ناک، ملما کتابی چہرہ بڑی بڑی لمبوتری آنکھیں، بڑا دہانہ، اونچا چوکا، آنکھوں کے نیچے کی ابھری ہوئی ہڈیاں، گہرا سانولا رنگ، داڑھی کلّوں پر ہلکی، ٹھوڑی پر زیادہ۔ غرض عجیبی مشابہت ان لوگوں میں ہے۔ شاید ہی کسی خاندان والوں میں ہو گی امیر تیمور سے لگا کر اس وقت تک ان کی شکل میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ پہلے تو قلعہ بھر کا ایک ہی لباس تھا۔ مگر اب کچھ دورنگی ہو گئی ہے۔ وجہ یہ ہوئی کہ جب سے سلیمان شکوہ

عہ اس مضمون میں جا بجا دہلی والوں کے لباس کا ذکر آیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذرا وضاحت سے اس لباس کو بتادوں تاکہ پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے اس محفل کا نقشہ اور اچھی طرح پھر جائے۔ مرزا نوشہ کا تو ذکر جانے ہی دو۔ وہ تو ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناتے ہیں ان کی ٹوپی دنیا بھر سے جدا تھی، رنترکی یعنی سنتا تاری کھال کو (خواہ وہ سمور ہو یا برہ) اس طرح لیا جاتا تھا کہ نیچے کا گھیر اوپر کے چندوے سے ذرا بڑا ہے۔ ان کے بعد چار کنگورے قائم کرکے کھال کو ٹوپی کی آدھی لمبان تک اس طرح کاٹ لیا کہ ٹوپی گڑگج کی شکل بن گئی۔ بیچ میں چندوے کی جگہ مخمل یا گہرے رنگ کی بانات کنگروں کے کناروں سے ملا کر سی لی، اندر استر دیدیا۔ چلو مرزا نوشہ کی ٹوپی ہو گئی۔ شہر میں کلاہ ترکی کا بہت استعمال ہے جس کو عام اصطلاح میں چوگوشیہ ٹوپی کہتے ہیں یہ بھی کئی وضع کی ہوتی ہیں اور کئی طرح پہنی جاتی ہیں جو ٹوپی شرفا استعمال کرتے ہیں اس کا دمہ (گوٹ) ذرا اونچا ہوتا ہے دمے کے اوپر چار پاکھے۔ پاکھے کی وضع بالکل شاہجہانی محراب کی سی ہوتی ہے۔ چاروں کو اس طرح ملا کر سیتے ہیں کہ چاروں کونے کرک (کرخ) کے نمونے کے ہو جائیں

(باقی اگلے صفحہ پر)

کا ادرہ کسے دربار میں رسوخ ہوا خاندان کے کچھ لوگ تو وہیں جا رہے ہیں اور کچھ ایسے ہیں کہ بنارس آتے جاتے رہتے ہیں۔ جو وہاں جاکر آتا ہے لباس میں نئی تراش خراش

(بقیہ) بعض لوگوں نے اس میں ذرا جدت بھی کی ہے، وہ یہ کہ دمے کو اونچا کرکے پاکھوں کی لمبان کو چوڑان سے کسی قدر بڑھا دیا ہے اور ان کے سل جانے کے بعد جو بیل پیدا ہوئے ہیں۔ ان کو بیچ کاٹ کر کلیاں ڈال دی ہیں۔ اس طرح بجائے چار بیل کے ٹوپی کے آٹھ بیل ہو گئے ہیں۔ خوبصورتی کے لئے دمے کے کناروں پر تیلی لیس اور گوشوں کے کناروں پر باریک قیطون لگاتے ہیں۔ بادشاہ سلامت کی ٹوپی ہوتی تو اسی نمونے کی ہے مگر سلمی ستارے کے کام سے بنی ہوئی اور جا بجا موتی اور نگینے ٹکے ہوتے۔ اس قسم کی ٹوپی کی طرح پہنی جاتی تھی۔ قلعہ والے تو پاکھوں کو کھڑا رکھتے ہیں۔ باقی لوگ ان کو کسی قدر دبا لیتے ہیں۔ جو ٹوپی آٹھ بیل کی ہوتی ہے۔ اس کے پاکھوں کو اتنا دباتے ہیں کہ گوشے دمے کے باہر مچیل کر کنول کی شکل بن جاتے ہیں۔ اس قسم کی ٹوپی ہمیشہ آڑی پہنی جاتی ہے۔ اور وہ بھی اس طرح کہ اس کا ایک کونہ بائیں بھوں کو دبائے۔ اس ٹوپی کے علاوہ اونچ چین کی ٹوپی کا بھی بہت رواج ہے۔ اس کا بنانا کچھ مشکل کام نہیں۔ ایک مستطیل کپڑے کے کناروں کو سر کے ناپ کے برابر سی لیا۔ نیچے تیلی کی گوٹ دیدی اور اوپر کے حصے میں چنٹ دے کر چھوٹا سا گول گتہ لگا دیا۔ دہلی کی دو پلڑی ٹوپی اور لکھنؤ کی ٹوپی میں صرف یہ فرق ہے کہ یہاں یہ ٹوپی اتنی بڑی بناتے تھے کہ سر پر منڈھ جائے۔ برخلاف اس کے لکھنؤ کی ٹوپی صرف بالوں پر دھری رہتی ہے۔ ان ٹوپیوں کے علاوہ بعض بعض لوگ پنج گوشیہ ٹوپی بھی پہنتے ہیں۔ اس ٹوپی میں پانچ گوشے ہوتے ہیں، لیکن اس کی کاٹ چوگوشیہ ٹوپی سے ذرا مختلف ہے۔ گوشوں کے اوپر کے حصے نوک دار ہوتے ہیں۔ بس سمجھ لو کہ جیسے فصیل کے کنگرے، نیچے دمے کی بجائے تیلی کی گوٹ ہوتی ہے۔ یہ ٹوپی قالب چڑھا کر پہنی

کرنا ہے۔ اسی طرح اس کا لباس آدھا نیز آدھا بٹیر ہو کر نہ لکھنؤ کا رہتا ہے نہ دہلی کا۔ اب جو لوگ یہاں بیٹھے ہیں ان ہی کو دیکھ لیجیے جو شہزادے لکھنؤ جا کر آئے ہیں ان

جاتی ہے۔ قالب چڑھ کر بس ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے ہمایوں کے مقبرے کا گنبد۔ عام لوگوں میں بڑے گول چندوے کی ٹوپی کا بھی بہت استعمال تھا۔ بعض تو بالکل سادی ہوتی ہیں اور بعض سوزنی کے کام یا فیتے کے کام کی ہوتی ہیں۔ اس ٹوپی کو بھی قالب چڑھا کر پہنتے ہیں۔ لباس میں انگرکھا بہت پسند کیا جاتا ہے۔ انگرکھے کی چولی اتنی نیچی ہوتی ہے کہ ناف تک آتی ہے۔ چونکہ ہر شخص کو کسرت کا شوق ہے اس لئے جسم کی خوبصورتی دکھانے کے لئے آستین بہت چست رکھتے ہیں اور بعض شوقین آستینوں کو آگے سے کاٹ کر الٹ دیتے ہیں۔ انگرکھے کے نیچے کرتہ بہت کم لوگ پہنتے ہیں۔ قلعے والوں کے انگرکھے کے اوپر جامہ وار یا مخمل کی خفتان ہوتی ہے، بہت تکلف کیا تو اس کے حاشیوں پر سمور لگا لیا۔ نہیں تو عموماً پتلی لیس لگاتے ہیں۔ بٹنوں کی بجائے صرف ایک تکمہ اور گھنڈی ہوتی ہے جس کو "عاشق معشوق یا چپٹے" کہتے ہیں۔ اس کی آستینیں ہمیشہ آدھی ہوتی ہیں قلعے میں تو اس کو خفتان کہا جاتا ہے۔ مگر شہر والے اس سینہ کھلے نیم آستین کو "شیروانی" کہتے ہیں۔ انگرکھے کے اوپر چوکور شامی رومال سموسہ کر کے پیٹھ پر ڈال لیتے ہیں۔ اس رومال کو عام اصطلاح میں "ارخ چیرہ" کہتے ہیں۔ کمر میں بھی پتی کر کے رومال لپیٹنے کا رواج ہے، مگر بہت کم، پاجامہ ہمیشہ قیمتی کپڑے کا ہوتا ہے۔ اکثر گلبدن، غلطے، مشروع موٹھڑے، اطلس یا گورنٹ کا ہوتا ہے۔ پرانی وضع کے جو لوگ ہیں وہ تو اب بھی ایک برُی کا پاجامہ پہنتے ہیں، مگر تنگ مہریوں کے پاجامے بھی چل نکلے ہیں۔ سلیم شاہی جوتی کا استعمال شروع ہو گیا ہے۔ پھر بھی دہلی کے شرفا گھیتلی جوتی زیادہ پسند کرتے ہیں۔ شاید ہی شہر بھر میں کوئی ہو گا جس کے ہاتھ میں بانس کی لکڑی اور گز بھر کا لٹھے کا چوکور رومال نہ ہو۔

(باقی اگلے صفحہ)

کے سر پر لکھنؤ کی دو پلڑی ٹوپی ہے، اونچی چولی کا انگرکھا ہے، نیچے باریک شربتی ململ کا کرتہ اور تنگ پاجامہ ہے، جنہوں نے قلعہ کبھی نہیں چھوڑا اُن کے جسم پر وہی پرانا لباس ہے سر پر چوگوشیہ ٹوپی، جسم پہ نیچی چولی کا انگرکھا، اس کے اُوپر عمل یا جامہ دار کی خفتانی، پاؤں میں گلبدن یا غلطے کا ایک برکا پاجامہ، جو لوگ لکھنؤ ہو آئے ہیں۔ اُنہوں نے دہلی کے لباس کے ساتھ ڈاڑھی کو بھی خیر باد کہہ دیا ہے، چہرے کی ساخت سے ان کو دہلی کا شہزادہ کہہ دو تو کہہ دو مگر لباس اور وضع قطع سے تو یہ ٹھیٹھ لکھنؤ والے معلوم ہوتے ہیں۔

استاد ذوق سب سے مل ملا کر شامیانے کے دائیں طرف بیٹھ گئے۔ مشاعرے میں شعراء کو سلسلے سے بٹھانا بھی ایک فن ہے۔ نواب زین العابدین خاں کی تعریف کروں گا کہ جس کو جہاں چاہا بٹھا دیا اور پھر اس طرح کہ کسی کو نہ کوئی شکوہ نہ شکایت۔ اگر کوئی ایسی جگہ بیٹھ جاتا جہاں ان کے خیال میں اس کو نہ بیٹھنا چاہئے تھا تو بجائے اس کے کہ اس کو وہاں سے اُٹھاتے خود ایسی جگہ جا بیٹھتے، تھوڑی دیر کے بعد کہتے "ارے بھئی، ذرا ایک بات تو سننا"۔ وہ آکر اُن کے پاس بیٹھ جاتا اُس سے باتیں کرتے رہتے

ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لمبی پور کا ٹھوس بھاری بانس لیتے، تیل پلاتے، مہندی مل کر باورچی خانے میں لٹکاتے، یہاں تک کہ اس کی رنگت بدلتے بدلتے سیاہ ہوجاتی اور وزن تو ایسا ہوجاتا کہ گویا سیسہ پلا دیا ہے۔ جو نکلتا ہے اینٹھتا ہوا نکلتا ہے، جس کا دیکھو چوڑا سینہ، پتلی کمر بنے ہوئے ڈنڈ۔ شرفا میں تو شاید ڈھونڈے سے ایک بھی نہ نکلے گا جس کو کسرت کا شوق نہ ہو اور بانک بنوٹ اور لکڑی نہ جانتا ہو۔ بچپن ہی سے ان فنون کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مقابلے ہوتے ہیں واہ واہ سے بچوں اور نوجوانوں کا دل بڑھاتے ہیں اور فنون سپاہ گری کو شرافت کا تمغہ سمجھتے ہیں۔

اتنے میں کوئی ایسا شخص آجاتا جس کو وہ خالی جگہ کے لئے موزوں سمجھتے اس سے کہتے "تشریف رکھیئے، وہ جگہ خالی ہے"۔ جب وہ جگہ بھر جاتی تو کسی بہانے اُٹھ جاتے اور اس طرح دو نشستوں کا انتظام ہو جاتا۔ شہزادوں کا سلیقے سے بٹھانا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ ذرا ذرا سی بات پہ بگڑ کر اُٹھ جاتے ہیں کہ واہ ہم اور یہاں بیٹھیں۔ پھر لاکھ منائیے وہ بھلا کیا ماننے والے ہیں۔ ان جھگڑوں کو اُستاد ذوق خوب سمجھتے تھے۔ اس لئے اپنے ساتھ والوں کا انتظام انہوں نے خود کر لیا مگر اس طرح کہ کسی کو یہ خیال بھی نہیں ہو کہ یہ محفل کا بندوبست کر رہے ہیں۔ کسی سے کہتے "صاحب عالم، ادھر آئیے"، کسی سے، کسی خاص جگہ کی طرف اشارہ کرتے، کہتے "بیٹھو، بھئی بیٹھو" غرض تھوڑی دیر میں پوری مجلس جم گئی۔ نشست کا یہ انتظام تھا کہ میر مشاعرہ کے دائیں جانب وہ لوگ تھے۔ جن کا تعلق قلعے سے تھا۔ اور بائیں طرف شہر کے دوسرے استاد اور اُن کے شاگرد، ایک چیز جو مجھے عجیب معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ قلعے والے جتنے آئے تھے۔ سب کے ہاتھوں میں بٹیریں دبی ہوئی تھیں۔ یہ بٹیر بازی اور مرغ بازی کا مرض قلعہ میں بہت ہے۔ روزانہ تیتروں، بٹیروں اور مرغوں کی پالیاں ہوتی ہیں۔ ایک شہزادے صاحب نے تو کمال کیا ہے، ایک بڑے چھکڑے پہ ٹھاٹھر لگا کر چھوٹا سا گھر بنا لیا ہے اور اوپر چھت پر مٹی ڈال کر کنگنی بو دی ہے۔ ٹھاٹھر میں خدا جھوٹ نہ بلائے تو لاکھوں ہی پدڑیاں ہیں۔ جہاں چاہا چھکڑا لے گئے اور پدڑیاں اڑا دیں ایسی سدھی ہوئی ہیں کہ جھلڑ سے ایک بھی چھٹ کر نہیں جاتی اُنہوں نے جھنڈی ہلائی اور وہ اُڑیں۔ اُنہوں نے آواز دی اور وہ آ کر چھت پہ بیٹھ گئیں۔

اُستاد ذوق کو آئے ہوئے چند ہی منٹ ہوئے ہونگے کہ مرزا فتح الملک بہادر بھی آ پہنچے۔ اُن کے ساتھ نواب مرزا خاں داغ تھے۔ میاں داغ کی کوئی سولہ، سترہ برس کی عمر ہوگی۔ رنگت تو بہت کالی ہے مگر چہرے پہ غضب کی نرماہٹ ہے، بڑی

بڑی غلافی آنکھیں، ستواں ناک، کشادہ پیشانی، سر پر سیاہ مخمل کی لیس لگی ہوئی مچو گوشیہ ٹوپی جسم میں ساسلیٹ کا انگرکھا، سبز گلبدنی کا پاجامہ، ہاتھ میں ریشمی رومال ہیں۔ تو ابھی نوعمر مگر شعر ایسا کہتے ہیں کہ سبحان اللہ، شہر بھر میں ان کی غزلیں گائی جاتی ہیں غرض ہوا دار فرش سے ملا کر لگا دیا گیا۔ پہلے میاں داغ اترے اور اتر کر[1] ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ ان کے بعد مرزا فتح الملک اترے ان کا نیچے قدم رکھنا تھا کہ سب ہمرد قد کھڑے ہو گئے۔ چار چوبدار سبز کھڑکی دار پگڑیاں باندھے نیچی نیچی سبز جامات کی چپکنیں پہنے، سرخ شالی رومال کمر سے لپیٹے، ہاتھوں میں گنگا جمنی عصا اور مورچھل لئے ہوئے ہوادار کے پیچھے تھے۔ ادھر مرزا فخرو نے فرش پر قدم رکھا ادھر عصا بردار ان کے سامنے آگئے اور مورچھل بردار پیچھے ہولئے۔ اس سلیقے سے یہ جلوس آہستہ آہستہ شامیانے تک آیا۔

مرزا فخرو نے شامیانے کے قریب کھڑے ہو کر سب کا سلام لیا۔ پھر چاروں طرف نظر ڈال کر کہا "اجازت" سب نے کہا "بسم اللہ، بسم اللہ" اجازت پاکر یہ شامیانے میں گئے اور سب کو سلام کر کے بیٹھ گئے۔ دوسرے سب لوگ بیٹھنے کی اجازت کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ان سب کی طرف نظر ڈال کر کہا "تشریف رکھیے، تشریف رکھیے" سب لوگ سلام کر کے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ استاد ذوق نے داغ کو اپنے قریب ہی ایک جگہ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ وہاں جا بیٹھے۔ مورچھل بردار شامیانے کے پیچھے اور عصا بردار سامنے کی صف کی پشت پر جا کھڑے ہوئے جب یہ انتظام سب ہو گیا تو نواب زین العابدین خاں آگے بڑھے، شامیانے کے پاس جا کر تسلیمات بجا لائے اور دو زانو

---

[1] مرزا فخرو کے ساتھ نواب مرزا خاں داغ کے آنے کی یہ وجہ تھی کہ نواب شمس الدین خاں کے پھانسی پانے کے بعد ان کی بیوی یعنی داغ کی والدہ کا نکاح مرزا فخرو سے ہو گیا تھا اور اسی نسبت سے داغ قلعہ میں رہتے تھے (نواب فتح الملک کا عرف مرزا فخرو تھا) ۱۲

ہوکر وہیں بیٹھ گئے۔ چپکے چپکے صاحب عالم سے کچھ باتیں کیں اور پھر اٹھ کر اپنی جگہ جا بیٹھے۔ ان کے اٹھ کر چلے جانے کے بعد نواب فتح الملک نے دونوں ہاتھ فاتحہ[1] کو اٹھائے۔ ساتھ ہی اہل مجلس نے ہاتھ اٹھائے۔ فاتحہ خیر کے بعد صاحب عالم نے فرمایا "اے خوشنوا یانِ چمن دہلی! میری کیا بساط ہے۔ جو آپ جیسے استادانِ فن کے ہوتے ہوئے میر مشاعرہ بننے کا خیال بھی دل میں لا سکوں۔ صرف حضرت پیر و مرشد کے فرمان کی تعمیل میں حاضر خدمت ہو گیا ہوں، ورنہ کہاں میں اور کہاں ایسے بڑے مشاعرے کی میر مجلسی، محبو! اس مشاعرے کی ایک خصوصیت تو آپ کو معلوم ہے کہ اس کے لئے کوئی "طرح" نہیں دی گئی۔ اس کی دوسری خصوصیت آپ یہ پائیں گے کہ بجائے ایک شمع کے دو شمعیں گردش کریں گی جس طرح "طرح" کے نکل جانے نے ایک دوسرے کے مقابلے میں فخر و مباہات کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ اسی طرح دو شمعوں کی وجہ سے پڑھنے میں تقدیم و تاخیر سے جو خیالات طبیعتوں کو مکدر کرتے تھے وہ بھی رفع ہو جائیں گے۔ مشاعرے کی ابتدا کرنے اور ختم کرنے کا خیال بھی اکثر دلوں میں فرق ڈالتا۔ لیکن اس مشاعرے میں میں نے انتہا کو ابتدا کر دیا ہے چنانچہ حضرت ظل سبحانی کے کلام معجز نظام سے مشاعرے کی ابتدا ہوگی اور اس کے بعد ہی میں اپنی غزل عرض کر کے ابتدا اور انتہا کے فرق کو مٹا دوں گا۔" یہ کہہ کر مرزا فخرو نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ دونوں چوبدار جو سامنے کھڑے تھے دونوں شمعیں اٹھا کر ان کے سامنے لائے۔ انہوں نے بسم اللہ کہہ کر فانوس اتارے اور شمعیں جلا کر فانوس چڑھا دیئے۔ چوبداروں نے شمعوں کو لے جا کر لگنوں میں رکھ دیا اور سیدھے کھڑے ہو کر مرزا فخرو کی طرف دیکھا۔ انہوں نے گردن سے اشارہ

---

[1] نواب فتح الملک بڑے کٹر مسلمان تھے کوئی کام بغیر فاتحہ خیر کے شروع نہ کرتے تھے اسی لئے سب قلعے والے ان کو "ملا" یا "ملیا" کہا کرتے تھے ۱۲

کیا۔ اشارہ پاتے ہی دونوں چوبداروں نے بآوازِ بلند کہا: "حضرات! مشاعرہ شروع ہوتا ہے" اس آواز کا سننا تھا کہ ایک سناٹا سا ہوگیا۔ قلعے والوں نے بٹیریں ہتھیلیوں میں بند کر، تکیوں کے پیچھے رکھ دیں۔ نوکروں نے جھٹ پٹ حقے سامنے سے ہٹا دیئے اور ان کی جگہ سب کے سامنے اگالدان، خاصدان اور پن دھنیے کی طشتریاں رکھ اپنی اپنی جگہ جا کھڑے ہوئے۔ اتنے میں بارگاہِ جہاں پناہی کا خواصی بادشاہ سلامت کی غزل لئے ہوئے قلعے سے آیا۔ اس کے ساتھ کئی نقیب تھے وہ خود شمع کے قریب آکر تسلیمات بجالایا اور غزل پڑھنے کی اجازت چاہی۔ مرزا فخرو نے گردن کے اشارے سے اجازت دی۔ وہ وہیں بیٹھ گیا۔ نقیبوں نے آواز لگائی۔

"حاضرین! حضرت ظلِ سبحانی صاحبقرانِ ثانی خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کا کلام معجز نظام پڑھا جاتا ہے۔ نہایت ادب کے ساتھ گوشِ دل سے سماعت فرمائیے۔"

۴۔ تکمیل

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے　　چمن میں خوشنوایانِ چمن کی آزمائش ہے

نقیب کی آواز کے ساتھ ہی سب اہلِ محفل دوزانو ہو سنبھل کر بیٹھ گئے اور پاسِ ادب سے سب نے گردنیں جھکا لیں۔ خواصی نے بادشاہ سلامت کی غزل خریطے میں سے نکالی، بوسہ دیا، آنکھوں سے لگایا اور بلند آواز سے سورٹھ کے سروں میں پڑھنا شروع کیا۔ الفاظ کی نشست، زبان کی خوبی، مضمون کی آمد اور سب سے زیادہ پڑھنے والے کے گلے نے ایک سماں باندھ دیا۔ ایک کیفیت تھی کہ زمین سے آسمان تک چھائی ہوئی تھی۔ کسی کو تعریف کرنے کا بھی ہوش نہ تھا۔ استادانِ فن ہر شعر پر جھومتے تھے کبھی کبھی

ذکو تعریف کرنے کا بھی ہوش نہ تھا۔ اُستادانِ فن ہر شعر پر جھومتے تھے۔ کبھی کبھی کسی کے منہ سے سبحان اللہ سبحان اللہ کے الفاظ بہت نیچی آواز میں نکل گئے تو نکل گئے ورنہ ساری مجلس پر ایک عالمِ بے خودی طاری تھا۔ مقطع پر تو یہ حال ہُوا جیسے کسی نے سب پر جادو کر دیا۔ ہر شخص وجد میں جھوم رہا تھا۔ باصرار تمام کئی کئی دفعہ مقطع پڑھوایا اور مضمون اور زبان کی چاشنی کا لطف اُٹھایا۔ لیجئے آپ بھی پڑھیے اور زبان کے مزے لیجئے ؎

نہیں عشق میں اس کا تو رنج ہمیں کہ قرار و شکیب ذرا نہ رہا
غمِ عشق تو اپنا رفیق رہا، کوئی اور بلا سے رہا نہ رہا

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا۔

ہمیں ساغرِ بادہ کے دینے میں اب کرے دیر جو ساقی تو ہائے غضب
کہ یہ عہدِ نشاط، یہ دورِ طرب نہ رہے گا جہاں میں سدا نہ رہا

لگے یوں تو ہزاروں ہی تیرِ ستم کہ تڑپتے رہے پڑے خاک پہ ہم
وے ناز و کرشمہ کی تیغِ دودم لگی ایسی کہ تسمہ لگا نہ رہا

ظفرؔ آدمی اُس کو نہ جانئے گا ہو وہ کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

غزل پڑھ چکنے کے بعد خواص نے کاغذ مرزا فخرو کے ہاتھ میں دیا۔ زرافشاں کاغذ پر خود حضرت ظلّ اللہ کے قلم کی لکھی ہوئی غزل تھی۔ خط ایسا پاکیزہ تھا کہ آنکھوں میں کھپا جاتا تھا۔ مرزا فخرو نے کاغذ لے کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ مملوک العلی نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا: صاحبِ عالم! ہمارا کیا منہ ہے جو ہم حضرت ظلِ سبحانی کی غزل کی جیسی چاہیئے ویسی تعریف کر سکیں، البتہ ان نوازشاتِ شاہی کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو

حضرت پیر و مرشد نے غزل بھیج کر شرکائے مشاعرہ پر مبذول فرمائی ہیں، بارگاہ جہاں پناہی میں ہمارا نا چیز شکریہ پیش کر کے ہماری عزت افزائی فرمائی جائے؟ مرزا فخرو نے خواص کی طرف دیکھا۔ اس نے عرض کی: قبلۂ عالم! میں یہ پیام جاتے ہی پیش گاہ عالی میں پہنچا دوں گا۔" خواص آداب بجا لا کر جانے والا ہی تھا کہ مرزا فخرو نے روکا اور کہا: جانے سے پہلے صاحب عالم و عالمیان حضرت ولی عہد بہادر کی غزل بھی پڑھتے جاؤ۔ چلتے چلتے مجھے عنایت کی تھی اور فرمایا تھا کہ کسی خوش گلو شخص سے پڑھوانا۔ بھلا تم سے زیادہ موزوں اور کون شخص مل سکتا ہے؟ یہ کہہ کر جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اور ایک کاغذ نکال کر خواص کو دیا۔ اس نے آداب کر کے کاغذ لیا اور وہیں بیٹھ کر یہ غزل سنائی۔

دل سے لطف و مہربانی اور ہے مہربانی کی نشانی اور ہے
قصۂ فرہاد و مجنوں اور ہے عشق کی میرے نشانی اور ہے
رو کئے سے کب مرے رکتے ہیں اشک بلکہ ہوتی خوں فشانی اور ہے
ہم سے اے دل آرا وہ کب ہوتے ہیں صاف ان کے دل میں بدگمانی اور ہے

غزل تو بہت پھسپھسی تھی مگر ولی عہد بہادر کی غزل تھی، بھلا کس کا جگرا تھا جو تعریف نہ کرتا۔ البتہ غالب اور مومن بالکل چپ بیٹھے رہے۔ بعض قلعے والوں کو بُرا بھی معلوم ہوا مگر ان دونوں کو خوب سمجھتے تھے کہ یہ سچی تعریف کرنے والے لوگ ہیں ولی عہد تو ولی عہد اگر بادشاہ سلامت کی بھی کمزور غزل ہو تو گردن تک نہ ہلائیں۔ القصہ خواص تو غزل پڑھ کر رخصت ہوا اور اب حاضرین جلسہ کے پڑھنے کی نوبت آئی۔ مرزا فخرو نے چوبدار کو اشارہ کیا۔ اس نے دونوں شمعیں لا شامیانے کے سامنے رکھ دیں۔ صاحب عالم نے اپنی غزل نکالی اور اِدھر اُدھر نظر ڈال کر اور گردن کو ذرا جھکا کر کہا: "بھلا میری کیا مجال ہے کہ آپ جیسے کاملین فن کے مقابلے میں کچھ پڑھنے کا دعویٰ

کردں۔ البتہ جو کچھ بُرا بھلا کہا ہے وہ بہ نظر اصلاح عرض کرتا ہوں۔

غم وہ کیا ہے جو جاں گزا نہ ہوا درد وہ کیسا جو لا دوا نہ ہوا
حال کھل جایئں غیر کے سارے پہ کردں کیا کہ تو مرا نہ ہوا
درد کیا جس میں کچھ نہ ہوتا تیز بات کیا جس میں کچھ مزا نہ ہوا
وہ تو ملتا، پر اے دلِ کم ظرف تجھ کو ملنے کا حوصلہ نہ ہوا
شکوۂ یار۔ اور زبان رقیب کھیل چھیڑا کوئی گلا نہ ہوا
تم رہو اور جمیع اغیار میرا کیا ہے ہوا، ہوا نہ ہوا
پھر تمہارے ستم اُٹھانے کو دمِ تز اچھا ہو برا نہ ہوا

مرزا فخرو کی آواز تو اونچی نہ تھی، مگر پڑھنے میں ایسا درد تھا کہ سُن کر دل بے قابو ہو جاتا تھا سارا مشاعرہ واہ واہ اور سبحان اللہ! کے شور سے گونج رہا تھا۔ تیسرے شعر پر مرزا غالبؔ نے پانچویں پر حکیم مومن خاں نے ایسے جوش سے واہ واہ کی کہ صف سے آگے نکل آئے۔ مرزا فخرو اپنی غزل پڑھتے رہے مگر ان دونوں کو اپنی دو شعروں کی رٹ لگی رہی۔ پڑھتے اور مزے میں آکر جھومتے جب غزل ختم ہوئی تو مرزا نوشہ نے کہا: "سبحان اللہ! صاحب عالم سبحان اللہ! واہ کیا کہنا ہے، شعر یوں کہتے ہیں، مزا آگیا۔" اُستاد ذوق بھی مسکرائے کہ چلو اسی بہانے سے میری تعریف ہو رہی ہے۔ مرزا فخرو نے اُٹھ کر سلام کیا اور کہا "یہ آپ اصحاب کی بزرگانہ شفقت ہے جو اس طرح ارشاد ہوتا ہے ورنہ من آنم کہ من دانم" وہ جدھر نظر ڈالتے لوگ تعریفیں کرتے اور وہ جھک جھک کر سلام کرتے۔ جب محفل میں ذرا سکون ہوا تو مرزا فخرو نے چوبدار کو اشارہ کیا اُس نے شامیانے کے سامنے سے ایک شمع اُٹھا، سامنے کی صف میں میاں بیابؔ ؏ کے آگے رکھ

؏ اس غزل میں ہی نے آخر ان کو نیچا دکھایا۔ ان کا روز روز اکھاڑے میں آکر خم ٹھونکنا اچھونا

دی۔ نام تو ان کا عبدالقادر تھا مگر شہر کا بچہ بچہ ان کو میاں یل کہتا تھا۔ ان کو اپنی طاقت پر اتنا غرور تھا کہ کسی پہلوان کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، جب اکھاڑے میں جاتے وہاں

(بقیہ) کو ناگوار گزرا۔ شیخو والوں کے اُستاد حاجی علی جان نے ایک پٹھا تیار کیا۔ بدن میں تو کچھ ایسا زیادہ نہ تھا مگر داؤ پیچ میں طاق تھا اور پھرتی اس بلا کی تھی کہ کیا کہوں۔ ایک دن جو میاں یل نے حسبِ معمول شیخو والوں کے ہاں آکر خم ٹھونکے تو لونڈا کپڑے اُتار بیڑا مدِ مقابل سامنے آگیا اور خم ٹھونک کر ہاتھ ملانا چاہا۔ میاں یل کو ہنسی آگئی کہ بھلا یہ پودنا میرا کیا مقابلہ کرے گا۔ ہاتھ ملانے میں تامل کیا۔ اُستاد علی جان نے کہا: "کیوں بھئی ہاتھ کیوں نہیں ملاتے یا تو ہاتھ ملاؤ یا پھر کبھی اس اکھاڑے میں آکر خم نہ ٹھونکنا"۔ کہنے لگے "اُستاد! جوڑ تو دیکھ لو، خواہ مخواہ اس لونڈے کو پٹوانے سے حاصل"۔ اُستاد نے کہا: "میاں جو جیسی کرے گا ویسی بھرے گا، دنگل میں تم اُسے کچل ڈالنا، یہی ہوگا ناکہ ہڈی پسلی تڑوا کر آئندہ کو کان ہو جائیں گے"۔ بہرحال دونوں ہاتھ مل گئے۔ تاریخ مقرر ہوگئی۔ اس عاشورے کے دو چار ہی دن بعد شاہی دنگل میں کشتی قرار پائی۔ عیدگاہ کے پاس ہی یہ دنگل ہے، دس پندرہ ہزار آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے مگر اس روز وہاں تل رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ جدھر نظر جاتی سر ہی سر دکھائی دیتے۔ میاں یل کی بیہودگیوں کی وجہ سے ساری دہلی اس لونڈے کی طرف تھی۔ پہلے چھوٹی موٹی کشتیاں ہوتی رہیں، ٹھیک چار بجے یہ دونوں جانگیے پہن چادریں پھینک دنگل میں اُترے۔ اُترتے ہی دونوں نے "یا علی" کا نعرہ مارا، دو چار ڈھکیلیاں کھائیں، کچھ بڑھ بڑھ کر مٹی سینے پر ڈالی اور خم ٹھونک کر آمنے سامنے آگئے۔ دونوں کے جسموں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ہاتھی اور چیونٹی کا مقابلہ تھا۔ تمام دنگل میں سناٹا تھا، سوئی بھی گرے تو آواز سن لو۔ ہاں آواز تھی تو یا علی کی یا خم ٹھونکنے کی، میاں یل نے لونڈے کا ہاتھ پکڑ جھٹکا دیا۔ وہ آگے کو جھکا یہ کمر پر آگئے۔ وہ چٹ غوطہ مار ہاتھوں کو چیر

خم ٹھونک آتے اور کسی کو جواب میں ان کے سامنے خم ٹھونکنے کی ہمت نہ ہوتی، پہلوانی کی نسبت سے تخلص یلؔی رکھا تھا۔ مضمون بھی رندانہ باندھتے تھے، پڑھتے اس طرح تھے کہ گویا میدانِ کارزار میں رجز پڑھ رہے ہیں۔ اس سے غرض نہ تھی کہ کوئی تعریف کرتا ہے یا نہیں کرتا، ان کو اپنے شعر پڑھنے سے کام تھا۔ غزل لکھی تھی:

کہہ دو رقیب سے کہ وہ باز آئے جنگ سے — ہرگز نہیں ہیں یار بھی کم اُس دبنگ سے
لب کا بڑھا دیا ہے مزا خطِ سبز نے — ساقی نے پشت دی مئے صافی کو بنگ سے
دل اُلجھے بے طرح سے پھنسا زلفِ یار میں — نکلے یہ کیونکہ دیکھئے قیدِ فرنگ سے
آجائیو نہ پیچ میں ظالم کے دیکھنا — یاری تو تم نے کی ہے یلؔی اس شوخ و شنگ سے

ان کی غزل ختم ہوتے ہی چوبدار نے دوسری شمع اٹھا، مرزا علی بیگ کے سامنے

(بقیہ) نکل گیا۔ انھوں نے اس کا سیدھا ہاتھ پکڑ دھوبی پاٹ پر کسنا چاہا وہ توڑ کر کے الگ جا کھڑا ہوا۔ یہ گاؤزوری کر کے اس کو دبا تو لیتے لیکن وہ اپنی پھرتی کی وجہ سے ذرا سی دیر میں صاف نکل جاتا آخر ایک دفعہ یہ اُس کو دباہی بیٹھے وہ چپکا پڑا رہا۔ انھوں نے ہفتے کس لئے۔ تھوڑی دیر تک اس کو خوب رگڑا وہ سہے چلا گیا۔ انہوں نے پہلو میں آ کسکر اس کا سینہ کھولنا چاہا، وہ بھی موقع تاک رہا تھا۔ یہ کھینچنے میں ذرا غافل ہوئے اُس نے ٹانگ پر باندھ جو اڑایا تو میاں چاروں خانے چت جا پڑے لونڈا اُچک سینے پر سوار ہو گیا۔ "وہ مارا، وہ مارا" کی آوازوں سے دنگل ہل گیا۔ لوگوں نے دوڑ لونڈے کو گود میں اُٹھا لیا۔ کسی نے یہ بھی پھر کر نہ دیکھا کہ میاں یلؔی کہاں پڑے ہیں۔ یہ بھی چپکے سے اُٹھ چادر اوڑھ منہ لپیٹ ایسے غائب ہوئے کہ پھر کسی نے ان کی صورت نہ دیکھی۔ دنگل سے کیا گئے۔ ہمیشہ کے لئے دہلی سے گئے تھے۔ بڑے غیرت مند وہ دن اور آج کا دن، پھر ان کی صورت نظر نہ آئی، خدا جانے کہاں دکمپ گئے۔

رکھ دی۔ یہ بڑے گورے چٹے نوجوان آدمی ہیں۔ کسرت کا بھی شوق ہے نازنین تخلص کرتے ہیں۔ دہلی میں بس یہی ایک ریختی گو ہیں۔ ادھر شمع رکھی گئی ادھر نواب زین العابدین خاں نے آواز دی "اوڑھنی لاؤ" ایک نوکر فوراً تاروں بھرے گہرے سرخ رنگ کی اوڑھنی لے کر حاضر ہوا۔ نازنین نے لے بڑے نازو انداز سے اس کو اوڑھا ایک پلّو کا بکل مارا، دوسرا پلّو سامنے پھیلا لیا اور خاصی بھلی چنگی عورت معلوم ہونے لگے۔ غزل ایسی لڑلڑا کر اور اٹھلا اٹھلا کر پڑھی کہ سارا مشاعرہ عش عش کرنے لگا۔ مزہ ایسا پیدا کرتے تھے کہ کوئی بیسوا بھی کیا کرے گی۔ دوسرا شعر تو اس طرح پڑھا کہ گویا "باجی" کو جلانے کے لئے سب کچھ کہنے کو تیار ہیں۔ تلچھٹ والوں کو تو اس غزل میں بڑا مزا آیا مگر جو ریختے کے استاد تھے وہ خاموش بیٹھے سنتے رہے۔ غزل یہ تھی۔

ہوئی عشاق میں مشہور یوسف سا جواں تاکا — ہوا ہم عورتوں میں تھا بڑا دیدہ زلیخا کا

مجھے کہتی ہیں باجی تو نے تاکا چھوٹے دیور کو — نہیں ڈرنے کی میں بھی ہاں نہیں تاکا تو اب تاکا

اگر اے نازنیں تو دُبلی پتلی کامنی سی ہے — چھریرا سا بدن نام خدا ہے تیرے دولہا کا

اب دونوں شمعیں اس طرح گردش کرنے لگیں کہ پہلے صف کے سیدھی جانب کا ایک شخص غزل پڑھتا تھا اور پھر اُلٹی طرف کا صفحہ ۶۷ پر ایک نقشہ دیتا ہوں اس سے نشست کی کیفیت پڑھنے والوں کا سلسلہ اور مشاعرہ کا انتظام اچھی طرح سمجھ میں آجائے گا۔

نازنین کے پڑھنے کے بعد دائیں جانب کی شمع ہٹ کر میاں عاشق کے سامنے آئی۔ یہ بچارے ایک مزدور پیشہ آدمی ہیں، لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتے، نہ کسی کے شاگرد ہیں نہ کسی کے استاد۔ شعر خاصہ اچھا کہتے ہیں۔ اس مشاعرے میں ایک شعر تو ایسا نکل گیا ہے کہ سبحان اللہ، لکھا ہے۔

فقط تو ہی نہ میرا اے بت تو خود دشمن ہے — ترے کوچے میں اپنا ہر در و دیوار دشمن ہے

(۱۲ رجب سنہ ۱۲۶۱ ہجری کے مشاعرہ میں شعرا کی نشست کا نقشہ)

تشنہ	تسکین	تائب	آزاد	شور	میر صاحب	برق	حضور	مہتاب	سالک

حزین، شہرت، عزیز، رقم، تعشق، اوج، تابش، تمکین، عاشق، یل، نازنین، تصویر، قلق، کامل، تجلی، جوش، یکتا، تنویر، جعفری

علائی، درخشاں، عارف، عیش، صہبائی، شیفتہ، آزردہ، مومن، غالب، رمز، ذوق، احسان، داغ، صابر، ظہیر، حیا، قناعت، رفعت، رسا

بسمل	مبیل	شوق	تسلی	نالاں	ماہر	جنوں	اشکی	حشمت	ایجاد

غزل میں باقی سارے اشعار تو صرف بھرتی کے تھے مگر اس شعر پر ہر طرف سے بڑی دیر تک واہ واہ ہوتی رہی۔ ان کے غزل ختم کرنے پر بائیں طرف کی شمع اُٹھا کر عبداللہ خاں اوجؔ کے سامنے رکھ دی گئی۔ یہ بڑے پُرانے ۴۰، ۴۵ برس کے مشاق شاعر ہیں۔ مضمون کی تلاش میں ہر وقت سرگرداں رہتے ہیں لیکن ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایسے بلند مضامین اور نازک خیالات لاتے ہیں کہ ایک شعر تو کیا ایک قطعے میں بھی ان کی سمائی مشکل ہے اور کوشش یہ کرتے ہیں کہ ایک ہی شعر میں مضمون کو کھپا دیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مطلب کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ بھلا دوسروں کو تو ان کے شعروں میں کیا مزا آئے اور کوئی کیا داد دے۔ ہاں یہ خود ہی پڑھتے ہیں خود ہی مزے لیتے ہیں اور خود ہی اپنی تعریف کر لیتے ہیں۔ غزل اس زور شور سے پڑھتے ہیں کہ زور میں آ کر صفِ مجلس سے گز دو گز آگے نکل جاتے ہیں۔ ان کے شاگرد تو دو چار ہی ہیں۔ مگر اُستاد بھی ان کو اُستاد مانتے ہیں، بھلا کس کا بل بوتہ ہے جو ان کو استاد نہ کہہ کر مفت کی لڑائی مول لے۔ اِدھر انہوں نے شعر پڑھا اُدھر استاد ذوق یا مرزا غالب نے داد دی داد دینے میں ذرا دیر ہوئی اوسان کے تیور بدلے ان کے غصّے کی بھلا کون تاب لا سکتا ہے۔ چارو ناچار تعریف کرنی پڑتی، جب کہیں جا کر یہ ٹھنڈے پڑتے غزل ہوئی تھی۔

دم کا جو دمدمہ یہ باندھے خیال اپنا	بے پُل صراط اُتریں یہ ہے کمال اپنا
طفلی ہی سے ہے مجھ کو وحشت سرا سے نفرت	گُم میں گڑا ہُوا ہے، آہو کے نال اپنا
کسبِ شہادت اپنا، ہے یاد کس کو قاتل	سانچے میں تیغ کے ہم لیتے ہیں ڈھال اپنا
چیچک کے آبلوں کی میں باگ توڑتا ہوں	(دکھ کے) دیوی کے آستاں پہ سمیں ہلال اپنا

آخری شعر پہ تو مرزا غالب اُچھل پڑے، کہنے لگے "واہ میاں اوجؔ اس شعر کے دوسرے مصرعے نے تو غضب ڈھا دیا ہے بھئی واللہ الفاظ رکھ کے" کیا

خوب پھنسائے ہیں۔ یہ سب کافر ہیں جو تمہیں اُستاد کہتے ہیں۔ میاں تم تو شعر کے خدا ہو خدا۔" غرض سب اُستادوں نے تعریفوں کے پُل باندھ دیئے اور میاں اوج ہیں کہ پھول کر کپا ہوئے جاتے ہیں۔ جب ذرا سکون ہُوا تو سیدھی طرف شمع کھسک کر محمد یوسف تمکینؔ کے سامنے آئی۔ اُن کی عمر کوئی ۱۵، ۱۶ سال کی ہوگی۔ مدرسۂ دہلی میں طالب علم ہیں۔ غضب کی ظریفانہ طبیعت پائی ہے۔ بات کرنے میں منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ نازک نازک نقشہ سانولا رنگ، بھرے بھرے ہاتھ پاؤں، جوان ہونگے تو بڑے خوبصورت آدمی نکلیں گے۔ غزل کہی تھی۔

دوزخ بھی جس سے مانگتی ہر دم پناہ تھی — کس دل جلے کی بارِ خدایا یہ آہ تھی

خانہ خراب ہو تیرا اے عشق بے حیا — ق — آئین کونسا تھا یہ کیا رسم و راہ تھی

تو نے جو دل کو میرے صنم خانہ کر دیا — رہتا خدا تھا جس میں یہ وہ بارگاہ تھی

تمکینؔ کو اک نگاہ میں دیوانہ کر دیا — جادو فریب آہ یہ کس کی نگاہ تھی

میاں تمکینؔ کا دل بڑھانے کو سب نے تعریف کی قطعہ کو کئی کئی دفعہ پڑھوایا اُستاد احساؔن نے کہا: "میاں یوسف! کیا کہنا ہے، خوب کہتے ہو کوشش کئے جاؤ ایک نہ ایک دن اُستاد ہو جاؤ گے۔ مگر میاں کسی کے شاگرد ہو جاؤ، بے اُستاد ہے تو ٹھیک نکلو گے۔" میاں تمکینؔ نے مسکرا کر کہا: "استاد! میں کہیں آپ کے حکم سے باہر ہو سکتا ہوں۔ کل ہی انشاء اللہ اُستاد اوجؔ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہوں۔" اُستاد ذوقؔ نے کہا: "ہاں بھئی ہاں، خوب انتخاب کیا۔ بس یہ سمجھو کہ چند ہی دن میں بیڑا پار ہے۔" یہاں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دوسری شمع غلام احمد تصویرؔ کے سامنے پہنچ گئی۔ ان کو میاں بتن بھی کہتے ہیں۔ الف کے نام بے نہیں جانتے مگر طبیعت غضب کی پائی ہے۔ پہلے میاں تنویرؔ کے شاگرد تھے، بعد میں ان سے ٹوٹ کر اُستاد ذوقؔ سے آملے۔ بھاری بدن، منڈی ہوئی داڑھی، چھوٹی چھوٹی مونچھیں

گہرا سانولا رنگ جسم پر سوسی کا تنگ مہری کا پاجامہ، اوپر سوسی کا کرتہ، کندھے پر لٹھے کا رومال، سر پہ سوزنی کے کام کی گول ٹوپی۔ بیچارے بنچہ بندی پر گزر اوقات کرتے ہیں۔ بڑے پر گو شاعر ہیں۔ لکھنا پڑھنا تو جانتے ہی نہیں، اس لئے جو کچھ کہتے دل و دماغ ہی میں ٹھونستے جاتے ہیں۔ یاد اس بلا کی ہے کہ ذرا چھیڑ دو تو ارگن کی طرح بجنے لگتے ہیں اور ختم کرنے کا نام ہی نہیں لیتے کلام ایسا پاکیزہ ہے کہ بڑے بڑے استادوں کے سر ہل جاتے ہیں۔ ان کو سنو تو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ایک اُمی پڑھ رہا ہے۔ بس یہی سمجھ لو کہ "الشعراء تلامیذ الرحمٰن" کی بہترین مثال ہیں۔ غزل کہی تھی :-

ہجر کی شب تو سحر ہو یارب — وہ نہ آیا تو قیامت ہی سہی
جان بے کار تو اپنی نہ گئی — اے ستم گر تری شہرت ہی سہی
مجھ سے اتنا بھی نہ کھنچیئے صاحب — آپ پہ میری طبیعت ہی سہی
جذبۂ دل نہیں لایا تم کو — آپ کی خیر عنایت ہی سہی

ہر شعر پہ واہ، واہ اور سبحان اللہ کے شور سے محفل گونج جاتی تھی۔ غزل تمام ہوئی تو استاد ذوق نے حکیم مومن خان کی طرف دیکھ کر کہا۔ "خان صاحب! یہ میاں بتن بھی غضب کی طبیعت لے کر آئے ہیں کہنے کو تو میرے شاگرد ہیں مگر اب تک ان کے کسی شعر میں اصلاح دینے کی مجھے تو ضرورت نہیں ہوئی۔ کل ایک غزل سنائی تھی میں تو پھڑک گیا۔ ایک شعر تو ایسا بے ساختہ نکل گیا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ ہاں میاں بتن وہ کیا شعر تھا" میاں بتن نے ذرا دماغ پہ زور ڈالا اور شعر دماغ سے پھسل زبان پہ آ گیا۔ مطلع تھا۔

برچھی تری نگاہ کی پہلو میں آ لگی — پہلو سے دل میں، دل سے کلیجے میں جا لگی

اور یہ شعر تھا۔

دامن پہ وہ رکھے نہ رکھے دل ربا لگی — لیکن ہماری خاک ٹھکانے سے آلگی

حکیم صاحب نے بہت تعریف کی اور کہا: "میاں بتّن یہ خدا کی دین ہے یہ بات پڑھنے پڑھانے سے پیدا نہیں ہوتی۔ میاں خوش رہو، اس وقت دل خوش کر دیا۔"

ان کے بعد شمع محمد جعفر 'تابش' کے سامنے آئی۔ یہ الہ آباد کے رہنے والے ہیں بہت دنوں سے دلّی میں آرہے ہیں۔ بچارے گوشہ نشین آدمی ہیں۔ شاعری سے دل لگا ہے، کوئی مشاعرہ نہیں ہوتا جہاں نہ پہنچتے ہوں۔ غزل میں دو شعر بہت اچھے تھے وہی لکھتا ہوں۔

کبھی بن بادہ رہ نہیں سکتے — توبہ کچھ ہم کو سازگار نہیں
دل میں خوش ہیں عدو، برائے تابش — وہ ستم گر کسی کا یار نہیں

مقطع کی کچھ ایسی پیاری بندش پڑی ہے کہ سب کے منہ سے بے ساختہ واہ واہ نکلتی مفتی صدر الدین صاحب کی تو یہ حالت تھی کہ پڑھتے تھے اور جھومتے تھے۔

تابش کے بعد اُلٹی جانب کی شمع میاں قلق کے آگے گئی۔ خدا ان سے محفوظ رکھے بڑے چالاک آدمی ہیں۔ عبدالعلی نام ہے، مدراس کے رہنے والے ہیں کوئی ۳۰ برس کی عمر ہے بچپن ہی میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے، حیدرآباد ہوتے ہوئے دہلی آئے۔ ہزاروں کو تعویذوں کے جال میں پھنسا کر بڑا کر دیا ان کی شکل سے لوگ گھبراتے ہیں۔ شاہ صاحب بنے پھرتے ہیں۔ مگر دل کا خدا مالک ہے۔ شعر خاصہ کہتے ہیں، لکھا تھا۔

خم شراب سے خم گردوں تو بن گیا — ساقی بنا دے ماہ پیالا اد چھال کے
ہم مشربوں میں چل کے قلق سے کشی کرد — جھگڑے وہاں نہیں ہیں حرام و حلال کے

یہ پڑھ چکے تو شمع[*] منشی محمود جان اوجؔ کے سامنے گئی۔ ان کی غزل میں دو ہی شعر ایسے تھے جن کی تھوڑی بہت تعریف ہوئی، باقی تو سب بھرتی کے تھے۔

آنے میں اُس جانِ جاں کے دیر ہے کچھ مقدر کا ہمارے پھیر ہے
ہے یقیں وہ جانِ جاں آتا نہیں موت کے آنے میں پھر کیوں دیر ہے

ان کے بعد مرزا کامل بیگ کی باری آئی۔ یہ سپاہی پیشہ آدمی ہیں، کاملؔ تخلص کرتے ہیں۔ مشاعرے میں بھی اوچی بن کر آئے ہیں۔ غزل اس طرح پڑھی گویا فوج کی کمان کر رہے ہیں۔ دیکھو تو مضمون میں بھی دیسی سپاہیانہ رنگ کی جھلک ہے۔ ان کی غزل میں قطعہ بڑے مزے کا تھا وہی لکھتا ہوں ؎

مژگاں سے گر بچے دلِ ابرو کرے ہے ٹکڑے یہ بات میں نے کہہ کر جب اس سے داد چاہی
کہنے لگا کہ ترکش جس وقت ہوئے خالی تلوار پھر نہ کھینچے تو کیا کرے سپاہی

اب حکیم سید محمد تعشق کے پڑھنے کا نمبر آیا۔ یہ بڑے پایہ کے ادیب ہیں ۶۳، ۶۴ برس کی عمر ہے۔ حکمت میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ غرض کیا کہوں ایک جامع کمالات شخص ہیں مگر اپنے آپ کو بہت دُور کھینچتے ہیں۔ اچھا شعر سنتے ہیں تو بیتاب ہو جاتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ جس طرح میں تعریف کرتا ہوں، اسی طرح دوسرے بھی میرے شعر کی تعریف کریں۔ شعر بُرا نہیں کہتے مگر ایسا بھی نہیں ہوتا کہ مشاعرہ چمک اُٹھے اور ہر شخص کے منہ سے بے ساختہ واہ واہ نکل جائے۔ اب خود ہی ان کا کلام دیکھ لیجئے۔

تجھ کو اس میری آہ و زاری پر رحم اے فتنہ گر نہیں آتا
وعدۂ شام تو کیا لیکن کچھ وہ آتا نظر نہیں آتا

---

[*] آئندہ یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ سیدھی طرف کی شمع بڑھی یا اُلٹی جانب سے بس یہ سمجھ لیجئے کہ پہلے دائیں طرف کا ایک شاعر پڑھتا تھا اور پھر بائیں طرف کا ۱۲

تیرے بیمار کا ہے یہ عالم — ہوش دو دو پہر نہیں آتا

تعریف تو ہوئی مگر کچھ ان کے دل کو نہ لگی اس لئے ذرا آزردہ سے ہو گئے ان کے بعد شمع میر حسین تجلّی کے سامنے آئی۔ یہ میر تقی میر کے پوتے ہیں، بڑے ظریف اور نکتہ سنج آدمی ہیں۔ کلام میں وہی میر صاحب کا رنگ جھلکتا ہے۔ زبان پر جان دیتے ہیں۔ غزل تو چھوٹی سی ہوتی ہے مگر جو کچھ کہتے ہیں اچھا کہتے ہیں۔ کیوں نہ ہو، آخر کس کے پوتے ہیں ؎

مری دفا پہ تجھے روز شک تھا اے ظالم — یہ سر، یہ تیغ ہے، لے اب تو اعتبار آیا
یہ شوق دیکھو پس مرگ بھی تجلّی نے — کفن میں کھول دیں آنکھیں شناجو یار آیا

دوسرے شعر پر وہ وہ تعریف ہوئی کہ میاں تجلّی کی باچھیں کھل گئیں۔

میاں تجلّی پڑھ چکے تو حکیم سکھانند رقم، کی باری آئی۔ ان کو میں حکیم مومن خاں صاحب کے مکان پر دیکھ چکا تھا۔ کلام تو ایسا اچھا نہیں ہوتا مگر پڑھتے خوب ہیں جہاں کسی نے ذرا بھی تعریف کی اور انہوں نے سلام کا تار باندھ دیا۔ غزل لکھی تھی۔

بجھانا آتش دل کا بھی کچھ حقیقت ہے — ذرا سا کام تجھے چشم تر نہیں آتا
عدم سے کوچۂ قاتل کی راہ ملتی ہے — گیا اُدھر جو گزر پھر اِدھر نہیں آتا
ہو خاک چارہ گری اس مریض کی تیرے — نظر میں تجھ سا کوئی چارہ گر نہیں آتا

تیسرا شعر حکیم مومن خاں صاحب کے رنگ کا تھا، اس کی انہوں نے بہت تعریف کی۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی کہا "میاں رقم! یا تو تم حکمت ہی کر دیا شعر کہو ان دونوں چیزوں کا ملا کر چلانا ذرا مشکل کام ہے۔"

شمع کا شیخ نیاز احمد جوش کے سامنے جانا تھا کہ شاگردان ذوق ذرا سنبھل بیٹھے۔ جوش کو اُستاد ذوق بہت عزیز رکھتے ہیں۔ ان کی عمر تو ۱۸، ۱۹ سال کی ہے مگر بلا کے طباع اور ذہین ہیں۔ ان کی سخن گوئی اور سخن فہمی کی قلعے بھر میں دھوم

ہے۔ مگر مشاعرے میں انہوں نے جو غزل پڑھی وہ تو مجھے پسند نہ آئی۔ ہاں قلعے والوں نے واہ واہ کے شور سے مکان سر پر اُٹھا لیا، اُستاد ذوق نے بھی سبحان اللہ! سبحان اللہ!! کہہ کر شاگرد کا دل بڑھایا۔ غزل دیکھ لیجئے ممکن ہے کہ میں نے ہی غلط اندازہ لگایا ہو ؎

کیونکر وہ ہاتھ آئے کہ یاں زور و زر نہیں — لے دے کے ہے اک آہ سو اس میں اثر نہیں
قسمت سے درد بھی تو ہوا وہ ہمیں نصیب — جس درد کا کہ چارہ نہیں، چارہ گر نہیں
قسمت ہی میں نہیں ہے شہادت وگرنہ یاں — وہ زخم کون سا ہے کہ جو کارہ گر نہیں
سجدے میں کیوں پڑا ہے ارے اُٹھ شراب پی — لے جوش میکدہ ہے خدا کا یہ گھر نہیں

آپ نے غزل ملاحظہ کر لی۔ میں تو اب بھی یہی کہوں گا کہ کوئی شعر بھی ایسا نہیں جو تعریف کے قابل ہو، اب زبردستی کی تعریفیں کرنا دوسری بات ہے۔

اُن کے بعد مولوی امام بخش صہبائی کے بڑے فرزند محمد عبدالعزیز کا نمبر آیا یہ عزیز تخلص کرتے ہیں۔ غزل خوب کہتے ہیں، کیوں نہ ہو بڑے باپ کے بیٹے ہیں۔ ہائے! کیا کیا شعر نکالے ہیں، لکھتے ہیں:

جوں شمع شغل تیرے مرا یا نیاز کا — جلنا جو سوز کا ہے تو رونا گداز کا
کج فہمیوں سے خلق کی دیکھا کہ کیا ہوا — منصور کو حریف نہ ہونا تھا راز کا
ہم عاصیوں کا بارِ گنہ سے جھکا ہے سر — اور خلق کو گمان ہے ہم پہ نماز کا
مغرور تھا ہی اور وہ مغرور ہو گیا — اس میں گلہ نہیں مجھے آئینہ ساز کا
اوروں کے ساتھ لطف سے تھا صورتِ نیاز — یاں بڑھ گیا دماغ تغافل سے ناز کا

ذرا سچ کہیئے گا، ساری کی ساری غزل مرصع ہے یا نہیں۔ ہاں اس غزل کی جو کچھ تعریف ہوئی وہ بجا ہوئی۔ اُستاد ذوق نے بھی کہا: بھئی صہبائی تمہارا یہ لڑکا غضب کا نکلا ہے۔ خدا اس کی عمر میں برکت دے، ایک دن بڑا نام پیدا کرے

گا۔ واہ میاں صاحبزادے واہ! کیا کہنا ہے! دل خوش ہوگیا۔ کیوں نہ ہو السیوں کے ایسے ہی ہوتے ہیں؟ میاں عزیز نے اُٹھ کر سلام کیا اور بیٹھ گئے۔

میاں عزیز کے بعد شمع خواجہ تعین الدین 'یکتا'، کے سامنے آئی۔ ان کا کیا کہنا، سرکار سے خطاب خانی پایا ہے۔ کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتے۔ کبھی کسی کے شاگرد ہوتے ہیں۔ کبھی کسی کے پہلے احسان سے تلمذ تھا، آج کل مرزا غالب کی طرف ڈھلک گئے ہیں۔ ایسے متلون مزاجوں کو نہ کبھی کچھ کہنا آیا ہے نہ آئے گا۔ میرا بڑا دل خوش ہوا کہ کسی نے تعریف نہیں کی۔ بڑے جلے ہونگے۔ بھلا ایسے شعروں کی کوئی خاک تعریف کرتا۔

اے آہ شعلہ زا یہ خس و خار بھی نہیں — نو آسمان ہیں، دو بھی نہیں چار بھی نہیں
ہے کس کو تاب شکوۂ دشمن کہ ضعف سے — لب پر ہمارے تذکرۂ یار بھی نہیں
جینا فراقِ یار میں وعدے کی لاگ پر — آسان گر نہیں ہے تو دشوار بھی نہیں

ہاں اب جس کے سامنے شمع آئی ہے وہ شاعر ہے۔ یہ کون ہیں مرزا حاجی جگ شہرت۔ گورا رنگ، میانہ قد، کوئی ۳۰، ۳۲ برس کی عمر، بڑے بنے سنورے رہتے ہیں۔ پہلے ان ہی کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا، اب تھوڑے دنوں سے بند ہے۔ مفتی صدرالدین صاحب کے شاگرد رشید ہیں۔ کہتے بھی خوب ہیں اور پڑھتے بھی خوب بڑی پاٹ دار آواز ہے، پڑھنے کا ڈھنگ ایسا ہے کہ ایک ایک لفظ دل میں اُتر جاتا ہے۔ ہر شعر پر تعریفیں ہوتیں اور کیوں نہ ہوتیں، ہر شعر تعریف کے قابل تھا، غزل یہ ہے:-

ایک دن دو دن کہاں تک تو بھی کچھ انصاف کر — یہ تو جلنا روز کا اے سوز ہجراں ہوگیا
ہے ترقی جوہر قابل ہی کے شایاں کہ میں — خاک کا پتلا بنا پتلے سے انساں ہوگیا
کعبۂ دیں میں تھا نہ کچھ عقدہ بجز بندِ نقاب — اُس کے کھلتے ہی یہ کارِ مشکل آساں ہوگیا

پہلے دعوائے خدائی اُس بتِ کافر کو تھا　　کچھ درستی پر جو آج آیا تو انساں ہوگیا

آخری شعر پہ تو مرزا غالب کی یہ حالت تھی کہ گویا بالکل مست ہوگئے ہیں رانوں پہ ہاتھ مارتے اور کہتے "وہ میاں شہرت واہ! کمال کر دیا، شعر کیا ہے اعجاز ہے۔ یہ ایک شعر بڑے بڑے دیوانوں پہ بھاری ہے۔ ہاں کیا کہا ہے سبحان اللہ!

پہلے دعوائے خدائی اُس بتِ کافر کو تھا　　کچھ درستی پہ جو آج آیا تو انساں ہوگیا

غرض اس شعر نے ایک عجیب کیفیت محفل میں پیدا کر دی تھی۔ لوگ خود پڑھتے ایک دوسرے کو سناتے، مزے لے لے کر جھومتے اور جوش میں واہ واہ اور سبحان اللہ کے نعرے مارتے تھے۔ بڑی دیر میں جا کر محفل میں ذرا سکون ہوا تو شمع نوازش حسین خان "تنویر" کے سامنے گئی۔ یہ نوجوان آدمی ہیں کوئی ۳۲، ۳۳ برس کے ہوں گے۔ بادشاہ سلامت ان کو بہت عزیز رکھتے ہیں، میاں شہرت کے شعر نے وہ جوش پیدا کر دیا تھا کہ ان کی غزل کسی نے بھی غور سے نہیں سُنی۔ غزل بھی معمولی تھی، صرف یہ قطعہ خاصہ تھا

جان کر دل میں مجھے اپنا مریضِ تپ غم　　کہتا لوگوں سے بظاہر بتِ عیار ہے کیا

رنگِ رُخ زرد ہے، تر چشم ہے لب پہ دم سرد　　پوچھنا اس سے کہ اس شخص کو آزار ہے کیا

یہ پڑھ چکے تو شمع میر بہادر علی "حزیں" کے سامنے رکھی گئی۔ یہ بڑے سنجیدہ متین اور وضع دار آدمی ہیں، عارف کے شاگرد ہیں۔ ان کا ایک شعر بڑے مزے کا ہے۔

سبو سے منہ لگائیں گے اب اتنا صبر ہے کس کو　　کہ بھرے خم سے جو شیشے میں اور شیشے سے ساغر میں

جو غزل انہوں نے اس روز مشاعرے میں پڑھی تھی، اس کے یہ دو تین شعر اچھے تھے

دنیا کی وسعتیں ترے گوشے میں آ گئیں　　اللہ رے وسعتیں تری اے تنگنائے دل

جل جل کے آخر ش تپشِ غم کے ہاتھ سے　　اک داغ رہ گیا ہے پہلو میں جائے دل

دیکھا وہ اپنی آنکھ سے جو کچھ سنا نہ تھا　　اور دیکھئے حزیں ابھی کیا کیا دکھلائے دل

مقطع کو سب نے پسند کیا اور واقعی ہے بھی اچھا۔

ان کے بعد شمع ایسے شخص کے سامنے آئی جو خود شاعر، جس کا باپ شاعر جس کا بھائی شاعر، جس کا سارا خاندان شاعر وہ کون؟ میاں باقر علی جعفری فخر الشعراء نظام الدین ممنون کے چھوٹے بھائی ملک الشعرا قمر الدین منت کے چھوٹے بیٹے۔ ان کی غزل میں زور نہ ہوگا تو اور کس کی غزل میں ہوگا۔ دو شعر لکھے ہیں

تیغ یوں دل پہ خیالِ نگہِ یار نہ کھینچ ناخدا ترس تو کعبے میں تو تلوار نہ کھینچ
بے سرو پا چمن و دشت میں عالم کے نہ پھر نازِ ہر گل نہ اٹھا منتِ ہر خار نہ کھینچ

غزل کی جیسی چاہیئے ویسی تعریف نہیں ہوئی۔ وجہ یہ ہے کہ یہ رنگ اب دہلی سے اُٹھتا جاتا ہے اب تو روزمرہ پہ لوگ جان دیتے ہیں اس میں اگر مضمون پیدا ہوگیا تو سبحان اللہ۔ مرزا غالب اس رنگ کے بڑے دلدادہ تھے، وہ بھی اس کو اب چھوڑتے جا رہے ہیں۔

اس کے بعد منشی محمد علی تشنہ کے پڑھنے کی باری تھی۔ چوبدار ان کے سامنے شمع رکھنے میں ذرا ہچکچایا۔ یہ ننگ دھڑنگ مزے میں دوزانو بیٹھے جھوم رہے تھے۔ چوبدار نے مرزا فخرو کی طرف دیکھا۔ انہوں نے آنکھ سے اشارہ کیا کہ رکھ دے۔ اس نے شمع رکھ دی۔ جب شمع کی روشنی آنکھوں پہ پڑی تو میاں تشنہ نے بھی آنکھیں کھولیں۔ کچھ سمجھ کر پھونک مار کر شمع گل کر دی اور کہا میں بھی کچھ عرض کر دوں۔ سب نے کہا "ضرور فرمایئے" انہوں نے نہایت آزادانہ لہجے میں کچھ گاتے ہوئے کچھ پڑھتے ہوئے یہ غزل سنائی:

آنکھ پڑتی ہے کہیں پاؤں کہیں پڑتا ہے سب کی ہے تم کو خبر اپنی خبر کچھ بھی نہیں
شمع ہے، گل بھی ہے، بلبل بھی ہے پروانہ بھی رات کی رات یہ سب کچھ ہے سحر کچھ بھی نہیں
حشر کی دھوم ہے سب کہتے ہیں یوں ہے یوں ہے فتنہ ہے اک تری ٹھوکر کا مگر کچھ بھی نہیں
نیستی کی ہے مجھے کوچۂ ہستی میں تلاش سیر کرتا ہوں اُدھر کی کہ جدھر کچھ بھی نہیں

ایک آنسو بھی اثر جب نہ کرے اے تشنہ　　　فائدہ رونے سے اے دیدۂ تر کچھ بھی نہیں

میں کیا بتاؤں کہ اس غزل کا کیا اثر ہوا۔ ایک سناٹا تھا کہ زمین سے آسمان تک چھایا ہوا تھا۔ غزل کا مضمون، آدھی رات کی کیفیت، پڑھنے والے کی حالت غرض یہ معلوم ہوتا تھا کہ ساری محفل کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ ادھر یہ عالم طاری تھا۔ اُدھر میاں تشنہ ہاتھ جھٹکتے ہوئے اور "کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں" کہتے ہوئے اُٹھے اور اسی عالم بے خودی میں دروازے سے باہر نکل گئے۔ ان کی "کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں" کی آواز بڑی دیر تک کانوں میں گونجتی رہی۔ جب ذرا طبیعتیں سنبھلیں تو سب کے منہ سے بے اختیار یہی نکلا کہ "واقعی کچھ بھی نہیں۔"

مرزا فخرو نے شمع منگا کر روشن کی اور کہا "ہاں صاحب پھر شروع کیجئے۔"

شمع حافظ محمد حسین بسمل کے سامنے رکھی گئی۔ بھلا تشنہ کے بعد ان کا کیا رنگ جمتا اول تو نومشق ہیں، مرزا قادر بخش صابر سے اصلاح لیتے ہیں، دوسرے غزل میں بھی کوئی خاص بات نہ تھی، البتہ مقطع اچھا تھا۔ غزل ملاحظہ ہو۔

دل تو نے ہم سے ادبیت کا فرا اُٹھالیا　　　اِس ناز کی یہ بوجھ یہ کیونکر اُٹھالیا

بارگرانِ عشق فلک سے نہ اُٹھ سکا　　　کیا جانے میرے دل نے یہ کیونکر اُٹھالیا

پیرِ مغاں نے بسمل میکش کو دیکھ کر　　　شیشہ بغل میں ہاتھ میں ساغر اُٹھالیا

بہر حال کسی نے سُنا کسی نے نہیں سُنا، کچھ تھوڑی بہت تعریف بھی ہوئی اور شمع میر حسین تسکین کے پاس پہنچ گئی۔ ان کی کوئی ۲۸ برس کی عمر ہوگی صہبائی کے شاگرد ہیں، مومن سے بھی اصلاح لی ہے۔ ان کا خاندان دہلی میں بہت مشہور ہے، انہی کے دادا امیر حیدر نے میر حسین علی وزیر فرخ سیر کو مارا تھا۔ سپاہی پیشہ آدمی ہیں، شعر بھی بُرا نہیں کہتے۔ لکھا تھا۔

ہزار طرح سے کرنی پڑی تسلیِ دل　　　کسی کے جانے سے کو خود نہیں قرار مجھے

شبِ وصال میں سننا پڑا افسانۂ غیر — سمجھتے کاش وہ اپنا نہ رازدار مجھے
وہ اپنے وعدے پہ محشر میں جلوہ فرمائیں — نہیں ہے ضعف سے انبوہ میں گزار مجھے
میرے قصور سے دیدار میں ہوئی تاخیر — نہ دیکھنا تھا تماشائے روزگار مجھے
مزے یہ دیکھے ہیں آغازِ عشق میں تسکیںؔ — کہ سوجھتا نہیں اپنا مآلِ کار مجھے

غرض اس غزل نے مشاعرہ کا رنگ پھر درست کر دیا اور لوگ ذرا سنبھل بیٹھے اُستاد احسان کے شاگرد خواجہ غلام حسین بیدل کے سامنے شمع آئی، انہوں نے یہ غزل پڑھی:۔

نگہ کی، چشم کی، زلفِ دوتا کی — سہے اِک دل جفا کس کس بلا کی
کب اُس گل کی گلی تک جا سکے ہے — ہوا باندھی ہے یاروں نے ہوا کی
بتوں سے ملتے ہو راتوں کو بیدلؔ — تمہیں بھی دن لگے، قدرت خدا کی

ساری کی ساری غزل بس ایسی تھی، بھلا اس کی کون تعریف کرتا۔ ہاں اس کے بعد جو غزل محمد حسین صاحب تائب نے پڑھی اس میں مزا آ گیا۔ میاں تائب مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے بھتیجے ہیں اور فخر الشعرا نظام الدین ممنون کے شاگرد۔ چھوٹی بحر میں ایسی غزل لکھتے ہیں کہ سبحان اللہ اور پڑھنا تو ایسا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ غزل تھی۔

پھر کتاں دار جگر چاک ہوا — پھر کوئی ماہ لقا یاد آیا
کہیے اس بت کو مشابہ کس کے — دیکھ کر جس کو خدا یاد آیا
عہدِ پیری میں جوانی کی اُمنگ — آہ کس وقت میں کیا یاد آیا

دوسرے اور تیسرے شعر پر تو یہ حال تھا کہ لوگ تعریفیں کرتے کرتے اور میاں تائب سلام کرتے کرتے تھکے جاتے تھے۔ جب ذرا جوش کم ہوا تو شمع اُستاد ذوق کے اُستاد غلام رسول شوق کے سامنے آئی۔ بچارے بڈھے آدمی

ہیں۔ شاہ نصیر کے شاگرد ہیں، مسجد عزیز آبادی میں امامت کرتے ہیں۔ شروع میں اُستاد ذوق نے ان کو اپنا کلام دکھایا تھا، اسی برتے پر یہ اپنے آپ کو اُن کا اُستاد کہا کرتے ہیں اور اب یہی چاہتے ہیں کہ ذوق اسی طرح آکر مجھ سے اصلاح لیا کریں مجھے تو کچھ سٹھیائے ہوئے سے معلوم ہوتے ہیں۔ غزل جو پڑھی تو واقعی اس کا مطلع بڑے زور کا تھا۔ باقی اللہ اللہ خیر صلا۔

لکھا ہوا ہے یہ اس مہ جبیں کے پردے میں نہیں ہے کوئی اب ایسا زمیں کے پردے میں

اُستاد ذوق کے چھیڑنے کو غالب، مومن، آزردہ، صہبائی غرض جتنے اُستادانِ فن تھے سب نے میاں شوق کی بڑی واہ واہ کی۔ وہ سمجھے کہ میرے کلام کی تعریف ہو رہی ہے یہ نہ سمجھے کہ بنا رہے ہیں۔ ذرا کسی نے واہ واہ کی اور انہوں نے اُستاد ذوق کی طرف دیکھ کر کہا؟ دیکھا شعر یوں کہتے ہیں؟ وہ بیچارے ہنس کر خاموش ہو جاتے اُن کے ایک آدھ شاگرد نے جواب دینا بھی چاہا مگر انہوں نے روک دیا۔

خدا خدا کر کے ان سے فراغت ہوئی تو شمع آزاد کے سامنے آئی۔ ان کا نام الگزنڈر ہیڈلے ہے۔ قوم کے فرانسیسی ہیں۔ دہلی میں پیدا ہوئے، یہیں تربیت پائی اور یہیں سے توپ خانے کے کپتان ہو کر اور گئے۔ کوئی ۳۱ سال کی عمر ہے۔ ڈاکٹری بھی جانتے ہیں، شعر و سخن کا بہت شوق ہے۔ عارف کے شاگرد ہیں۔ جہاں مشاعرے کی خبر سُنی اور دہلی میں آموجود ہوئے۔ لباس تو دہی فوجی ہے مگر بات چیت اُردو میں کرتے ہیں۔ ایسی صاف اُردو بولتے ہیں جیسے کوئی دہلی والا بول رہا ہے۔ شعر بھی کچھ بُرے نہیں ہوتے۔ ایک فرانسیسی کا اُردو میں ایسے شعر کہنا واقعی کمال ہے۔ غزل ملاحظہ ہو۔

وہ گرم رو راہ معاصی ہوں جہاں میں گرمی سے رہا نام نہ دامن میں تری کا

کچھ پاؤں میں طاقت ہو تو کر دشت نوردی حاصل ہے مزہ دیکھ ذرا جیب دری کا

چہلم کو عیادت کے لئے دو مرے آئے ‏ ‏ ‏ آزاد مٹھ کا نا بھی ہے اس بے خبری کا

آزاد کے بعد شمع دوسری طرف میر شجاعت علیؔ تسلیؔ کے پاس آئی۔ بچارے غریب صورت، فرسودہ لباس، کوئی ۶۵،۶۴ برس کے آدمی ہیں شاہ نصیر کے بڑے چاہیتے شاگردوں میں تھے۔ اپنے زمانے کے جراُت سمجھے جاتے تھے۔ اب بہت دنوں سے دنیا سے کنارہ کشی کرکے قدم شریف میں جا رہے ہیں۔ مشاعرے کی کشش کبھی کبھی ان کو دہلی کھینچ لاتی ہے۔ پڑھنے کا انداز بھی نرالا ہے، اس طرح پڑھتے ہیں جیسے کوئی باتیں کرتا ہو۔ غزل دیکھ لیجئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عاشق و معشوق میں سوال و جواب ہو رہے ہیں۔

کیسی ٹھوکر جڑے ہے حضرتِ دل ‏ ‏ ‏ پاؤں پہ اس کے سر دھرو تو سہی
جب کہا میں نے تم پہ مرتا ہوں قطعہ ‏ ‏ ‏ تم گلے سے مرے لگو تو سہی
بولے وہ کیا مزے کی باتیں ہیں ق ‏ ‏ ‏ خیر ہے کچھ پرے ہٹو تو سہی
غیر کی کل وہ لگ کے چھاتی سے ‏ ‏ ‏ مجھ سے کہنے لگے، سُنو تو سہی
اس لئے اس کے ہم گلے سے لگے ‏ ‏ ‏ کہ ذرا جی میں تم جلو تو سہی

اس غزل کی جیسی تعریف ہونی چاہیئے تھی ویسی نہیں ہوئی، کیوں کہ اب وہ وقت آگیا تھا کہ نیند کے خمار سے سر میں چکر آنے لگے تھے اور بُرے بھلے کی تمیز دشوار ہوگئی تھی۔ اس کے بعد جو دو غزلیں ہوئیں وہ بس ہوگئیں، نہ کسی نے شوق سے سُنا اور نہ مزہ آیا۔

میاں تسلی کے بعد شور نے غزل پڑھی۔ یہ کوئل کے رہنے والے ہیں۔ قوم کے عیسائی ہیں اور نام جارج پیس ہے یہ معلوم نہیں کہ کس کے شاگرد ہیں۔ ہاں اکثر دہلی آتے جاتے رہتے ہیں جو کچھ کہہ لیتے ہیں، بہت غنیمت ہے۔ غزل۔

عاجز تھا اپنی جان سے ایسا ترا مریض ‏ ‏ ‏ دیکھے سے جس کے حالتِ عیسیٰ تباہ تھی

بل بے یہ بیخودی کہ خودی سے بھلا دیا   ورنہ یہ زیست مرگ کی اپنے گواہ تھی
دیر و حرم میں تو نہ دے ترجیح زاہدا!   جس طرف سر جھکا وہی بس سجدہ گاہ تھی

ان کے بعد محمد عسکری 'نالاں' کی باری آئی۔ بھلا اس نوے برس کے بڈھے کی آواز نیند کے خمار میں کسی کو کیا سُنائی دیتی۔ مصحفی کے سب سے پہلے شاگرد ہیں۔ اب تو ان کو بس تبرک سمجھ لو۔ شعر بھی وہی بادا آدم کے وقت کے کہتے ہیں۔

سحر کے ہونے کا دل کو خیال رہتا ہے   شبِ وصال بھی دل کو ملال رہتا ہے
وہ بدگماں ہوں کہ اُس بُت کے سایہ پر بھی مجھے   رقیب ہی کا سدا احتمال رہتا ہے۔

میاں نالاں نے پڑھنا ختم ہی کیا تھا کہ شمع میر صاحب کے سامنے پہنچ گئی۔ شمع کا دکھنا تھا کہ ہر شخص سنبھل کر بیٹھ گیا۔ بعض نے انگلیوں سے آنکھیں مل ڈالیں، بعض نے کرتے کے دامن سے رگڑ لیں، بعض اُٹھ اور پانی کا چھپکا منہ پر مار آ بیٹھے، کیسی نیند اور کہاں کا سونا، میر صاحب کے نام نے سب کو چاق چوبند کر دیا۔ مرزا فخرو اب تک ایک پہلو بیٹھے تھے، انہوں نے بھی پہلو بدلا۔ اُستادانِ فن کے چہروں پر مسکراہٹ آئی۔ نوجوانوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں، میر صاحب بھی صف سے کچھ آگے نکل آئے۔ مرزا فخرو نے کہا: "میر صاحب! یہ ٹھیک نہیں، آپ تو بیچ میں آ کر پڑھیئے!" یہ کہہ کر چوبدار کو اشارہ کیا اس نے دونوں شمعیں اُٹھا وسط صحن میں رکھ دیں۔ میر صاحب بھی اپنی جگہ سے اُٹھ شامیانے کے عین سامنے آ بیٹھے بھلا دہلی میں کون ہے جو میر صاحب کو نہیں جانتا، کونسا مشاعرہ ہے جو ان کی وجہ سے چمک نہیں اُٹھتا، کون سی محفل ہے جہاں ان کے قدم کی برکت سے رونق نہیں آجاتی۔ ان کا نام تو شاید گنتی کے چند لوگ جانتے ہوں، ہم نے تو جب سُنا ان کا نام میر صاحب ہی سُنا، کوئی ستر برس کی عمر ہے، بڑے سوکھے سہمے آدمی ہیں، غلافی آنکھیں، طوطے کی چونچ جیسی ناک، بڑا دہانہ، لمبی داڑھی، بٹیا سا سر، خشخاشی بال، گوری رنگت اونچا قد، غرض ان کے حلیے کو دہلی کے کسی بچے سے بھی پوچھئے تو پورا پورا بتا دے نہایت صاف ستھرا لباس، سفید

ایک بر کا پاجامہ، سفید کرتا اس پر سفید انگرکھا، سر پر ارخچین کی ٹوپی، چہرے پر متانت بلا کی تھی۔ مگر جب غصہ آتا تھا تو پھر کسی کے سنبھالے نہ سنبھلتے تھے، چھوٹا ہو یا بڑا کوئی ان سے بغیر مذاق کے بات نہیں کرتا تھا۔ اور یہ بھی تڑ سے وہ جواب دیتے تھے کہ منہ پھر جائے۔ اس سے ان کو غرض نہ تھی کہ جواب ہو بھی گیا یا نہیں، مشاعرے میں بادشاہ سلامت سے لیکر میاں تمکین تک ان کو چھیڑتے تھے۔ انہوں نے نہ ان کا بُرا مانا نہ اُن کا جواب دینے میں نہ ان سے رُکے نہ ان سے، غزل ہمیشہ فی البدیہ پڑھتے تھے۔ لکھ کر لانے کی کبھی تکلیف گوارا نہیں کی۔ غزل میں مصرعوں کے توازن کی ضرورت ہی نہ تھی۔ صرف قافیہ اور ردیف سے کام تھا۔ جو کچھ کہنا ہُوا نہایت اطمینان سے نثر میں بیان کرنا شروع کیا۔ بیچ میں دوسروں کے اعتراضوں کا جواب بھی دیتے رہے۔ جب کہتے کہتے تھک گئے تو ردیف اور قافیہ کے شعر کو ختم کر دیا۔ انہوں نے شعر پڑھنا شروع کیا۔ اور چاروں طرف سے اعتراضوں کی بوچھار ہوئی۔ یہ بھلا کب دبنے والی اسامی ہیں، بچھ بچھا لڑتے، جب زبان سے نہ دبا سکتے تو زور میں آکر کھڑے ہو جاتے یہ کھڑے ہوتے اور کسی نہ کسی نے ان کو بٹھا دیا معترض کو ڈانٹا میر صاحب کا دل بڑھایا اور پھر وہی اعتراضوں کا سلسلہ شروع ہُوا اور تو اور مولوی مملوک العلی صاحب کو ان سے اُلجھنے میں مزا آتا تھا۔ یہ بھی مولوی صاحب کی وہ خبر لیتے تھے کہ اگر ان کا کوئی شاگرد سُن لیتا تو مدرسے سے مولوی صاحب کا سارا رعب داب رخصت ہو جاتا۔

میر صاحب؎ نے شمع کے سامنے بیٹھتے ہی ساری محفل پر ایک نظر ڈالی اور کہا۔

؎ غدر کے بعد میر صاحب کا انتقال ہوا ہے میاں کالے صاحب کے فرزند میاں نظام الدین صاحب کے مکان پر جو مشاعرہ ہوتا تھا اس میں بھی یہ شریک ہوتے تھے۔ اس مشاعرے کے دیکھنے والے اب بھی دہلی میں بہت موجود ہیں۔ ان ہی لوگوں کی زبانی میر صاحب کے حالات معلوم ہوئے اور درج کئے گئے۔ تذکروں میں تو ان بچارے کا کہیں ذکر آنے لگا۔

"حضرت! میں آج میاں ہد ہد کی شان میں ایک قصیدہ سناؤں گا۔ اپنے منہ میاں مٹھو، یہ اپنی تعریف خود تو بہت کچھ کر چکے ہیں اب ذرا دل لگا کر اپنی ہجو بھی سن لیں۔"

میاں ہد ہد سے سب جلے بیٹھے تھے، اب جو سنا کہ ان کی ہجو ہو رہی ہے اور پھر وہ بھی میر صاحب کے منہ سے، سب نے کہا "ہاں میر صاحب ضرور فرمایئے۔" میاں ہد ہد حکیم آغا جان 'عیش' کے پٹھو تھے۔ اور ان ہی کے بل پر بھد کتے تھے، اب جو حکیم صاحب نے سنا کہ میر صاحب ہد ہد کی ہجو پہ اتر آئے ہیں تو بہت پریشان ہوئے۔ ڈر تھا کہ کہیں مجھ کو بھی نہ لپیٹ لیں، دوسرا کوئی ہجو کرے تو جواب بھی دیا جائے۔ بھلا میر صاحب کی ہجر طویل کا کون جواب دے سکتا ہے اور تو کچھ بن نہ پڑا، میاں ہد ہد کو گاؤ تکیہ کے پیچھے غائب کر دیا۔ اب جو میر صاحب ادھر نظر ڈالتے ہیں تو ہد ہد ندارد ہیں، بہت گھبرائے ادھر دیکھا ادھر دیکھا، جب کسی طرف نظر نہ آئے تو کہا "ہجو ملتوی کر کے اب میں غزل پڑھتا ہوں" سب نے کہا "ہیں! میر صاحب، یہ آپ نے ارادہ کیوں تبدیل فرما دیا۔ پڑھیئے میر صاحب! خدا کے لئے پڑھیئے۔ سودا کے بعد ہجو تو اردو زبان سے اٹھ ہی گئی، اگر آپ بھی اس طرف توجہ نہ کریں گے تو غضب ہو جائے گا، زبان ادھوری رہ جائے گی۔" میر صاحب نے کہا "ناجی! نا میاں ہد ہد ہوتے تو ہم کو جو کچھ کہنا تھا۔ ان کے منہ پر کہتے، ان کے پیٹھ پیچھے ان کو کہنا ہجو نہیں، غیبت کرنے والوں پہ لعنت بھیجتا ہوں۔" جب میر صاحب کا یہ رنگ دیکھا تو حکیم آغا جان کے دم میں دم آیا انہوں نے بھی اس ہجو اور غیبت کے فرق کے متعلق چند مناسب الفاظ کہے اور خدا خدا کر کے یہ آئی بلا ٹلی۔

اب میر صاحب نے غزل شروع کی۔ کیا پڑھا، خدا ہی بہتر جانتا ہے، بس اتنا تو معلوم ہوا کہ تیر، پیر، کھیر قافیہ اور "ہے" ردیف ہے۔ اس کے علاوہ میں تو کیا، خود میر صاحب بھی نہیں بتا سکتے کہ انہوں نے کیا پڑھا اور مضمون کیا تھا۔ جہاں قافیہ اور ردیف آئی لوگوں نے سمجھ لیا کہ شعر پورا ہو گیا اور تعریفیں شروع ہوئیں۔ کسی نے ایک آدھ

اعتراض بھی جڑ دیا۔ اعتراض ہُوا اور میر صاحب بگڑے۔ ان کے بگڑنے میں سب کو مزا آتا تھا۔ اعتراضوں اور میر صاحب کے جوابوں کا رنگ بھی دیکھ لیجئے۔ غزل میں میر صاحب نے جو ایک مصرعے کو کھینچنا شروع کیا تو اتنا کھینچا، اتنا کھینچا کہ شیطان کی آنت ہوگیا۔ مولوی مملوک العلی صاحب نے کہا: "اجی میر صاحب! یہ مصرعہ بحرِ طویل میں جا پڑا!" میر صاحب نے کہا: "مولوی صاحب کبھی بحرِ طویل دیکھی بھی ہے یا یوں ہی سنی سنائی باتوں پر اعتراض ٹھوک دیا۔ پہلے مطوّل[1] پڑھئے مطول جب معلوم ہوگا کہ بحرِ طویل کس کو کہتے ہیں۔" مولوی صاحب بڑے چکرائے کہنے لگے۔

"میر صاحب، بھلا مطول کو بحرِ طویل سے کیا واسطہ، ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ، آپ کا جو جی چاہتا ہے کہہ جاتے ہیں۔" میر صاحب کو اب کسی حمایتی کی تلاش ہوئی مولٰینا صہبائی کی طرف دیکھا انہوں نے کہا: "مولوی صاحب! مطول میں بحرِ طویل کی بحریں نہیں ہیں تو اور کیا ہے، آپ بھی ہمارے میر صاحب کو اپنی علمیت کے دباؤ سے خاموش کر دینا چاہتے ہیں۔" بس اتنی مدد ملنی تھی کہ میر صاحب شیر ہو گئے، کہنے لگے: "جی ہاں مولوی صاحب آپ سمجھے ہوں گے کہ آپ کے سوا کسی نے مطول پڑھی ہی نہیں۔ اجی حضرت میں تو روزانہ اس کے دو دور کرتا ہوں کل ہی اس کی ایک بحر میں غزل لکھنے بیٹھا تھا، لکھتے لکھتے تھک گیا، ایک مصرعہ کوئی ڈیڑھ سو صفحے میں لکھا، وہ تو کہو کہ بیاض کے صفحے ہی ختم ہوگئے جو مصرعہ ختم ہُوا ورنہ خدا معلوم اور کہاں تک جاتا۔" مرزا نوشہ نے کہا: "میر صاحب! آپ سچ فرماتے ہیں ہمارے مولوی صاحب نے بحرِ طویل کہاں دیکھی۔ مجھ سے پوچھو، میرے بھتیجے خواجہ امان کو جانتے ہو انہوں نے ایک کتاب "بوستانِ خیال" لکھی ہے۔ یہ بڑی اور یہ موٹی، بارہ جلدیں ہیں، بحرِ طویل

---

[1] علم الکلام پر حضرت امام غزالیؒ کی ایک مشہور تصنیف کا نام مطول ہے ۱۲

کے بس بارہ مصرعوں میں ساری جلد یں ختم ہوگئی ہیں۔ آپ کا مصرعہ بحر طویل میں نہیں، رباعی کی بحر میں ہے " میر صاحب نے بڑے زور سے "ہیں" کی اور بگڑ کر کہا، واہ مرزا صاحب یہ سیدھا چلتے چلتے بھٹک گئے، رباعی کی بحریں آپ کو معلوم بھی ہیں، بھلا بتائیے تو سہی کون سی کتاب میں ہیں ؟ یہ ذرا ٹیڑھا سوال تھا، مرزا غالب ذرا چپ ہوئے تو خود میر صاحب نے کہا "میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ آپ نے زبردستی اعتراض کر دیا ہے۔ مرزا صاحب! اربعین پڑھئے، جب معلوم ہوگا کہ رباعی کی بحریں کون کون سی ہیں۔"

غرض اسی طرح کی خوش مذاقی میں کوئی گھنٹہ بھر گزر گیا۔ ہنستے ہنستے جو آنسو نکلے، انہوں نے نیند کے خمار سے آنکھیں صاف کر دیں اور ایسا معلوم ہونے لگا گویا مشاعرے کا دوسرا دَور شروع ہو رہا ہے اور سب لوگ تازہ دم ابھی آکر بیٹھے ہیں جب لوگ اعتراض کرتے کرتے اور میر صاحب جواب دیتے دیتے تھک گئے تو ایک دفعہ ہی میر صاحب نے کہا "حضرات! غزل ختم ہوئی" سب نے کہا " میر صاحب! ابھی مقطع تو آیا ہی نہیں، بے مقطع کی یہ کیسی غزل" میر صاحب نے فرمایا "مقطع کی اس شاعر کو ضرورت ہے جو بتانا چاہے کہ یہ غزل میری ہے، ہمیں اس کی ضرورت نہیں، ہماری غزل کی یہی پہچان ہے۔ جہاں شروع کی بس معلوم ہو گیا کہ یہ میر صاحب کے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی" یہ کہتے کہتے انہوں نے جزدان گردانا اور اپنی جگہ آ بیٹھے۔ ایک شمع اٹھا کر میر صاحب کے عین مقابل کے شاعر مرزا جمعیت شاہ ماہر کے سامنے رکھ دی گئی۔ یہ شاہ عالم بادشاہ غازی انار اللہ برہانہ کے پوتے اور صابر کے شاگرد ہیں۔ کلام صاف اور

۱؎ اربعین فی اصول الدین حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک مشہور تصنیف ہے جس کو میر صاحب نے رباعیوں کی بحروں سے متعلق کر دیا۔

زبان بڑی میٹھی ہے لکھا تھا۔

ہم بھی ضرور کعبہ کو چلتے پر اب تو شیخ — قسمت سے بتکدے ہی میں دیدار ہو گیا
ناصح کی بات سننے کا کس کو یہاں دماغ — تیرا ہی ذکر تھا کہ میں ناچار ہو گیا
اے ہمنشیں وہ حضرت ماہر نہوں کہیں — اک پارسا سُنا ہے کہ مے خوار ہو گیا

میر صاحب کے کلام نے سب کی آنکھوں سے نیند کا خمار اُتار دیا تھا، اس لئے اس غزل کی جیسی چاہیئے ویسی تعریف ہوئی اور میاں ماہر کو محنت کا پورا پورا صلہ مل گیا۔

ان کے بعد شمع قاضی نجم الدین برق کے سامنے آئی۔ یہ سکندر آباد کے رہنے والے ہیں کوئی ۲۰، ۲۲ برس کی عمر ہے، سر پہ لمبے لمبے بال، سانولی رنگت، اس میں سبزی جھلکتی ہوئی، اونچا قد، وجیہ صورت، سفید غرارہ دار پاجامہ، سفید انگرکھا، دوپلڑی ٹوپی، بڑے خوش مزاج، شیریں کلام، ہنس مکھ، بذلہ سنج، وارستہ مزاج، رند مشرب آدمی ہیں۔ پہلے مومن خاں کے شاگرد تھے مہران کے ایما سے میاں تسکین کو کلام دکھلانے لگے۔ آواز بڑی دلکش اور طرز ادا خوب ہے۔ غزل بھی ایسی پڑھی کہ واہ، واہ کہتے ہیں۔

بزم اغیار ہے، ڈر ہے نہ خفا تو ہو جائے — ورنہ اک آہ میں کھینچوں تو ابھی ہو ہو جائے
حرم و دیر کے جھگڑے ترے چھپنے سے پڑے — ورنہ تو پردہ اُٹھا دے تو، تو ہی تو ہو جائے
کچھ مزہ ہے یہ ترے روٹھ کے من جانے کا — چاہتا ہوں یوں ہی ہر روز خفا تو ہو جائے
تو تو جس خاک کو چاہے وہ بنے بندۂ پاک — میں خدا کس کو بناؤں جو خفا تو ہو جائے
آپ انکار کریں وصل سے میں درگورا — کچھ تو ہو جس سے طبیعت مری یکسو ہو جائے
ہو نہ ہو بس میں کوئی کچھ نہیں اس کی پروا — دل بیتاب پہ اے برق جو قابو ہو جائے

اللہ اللہ! ادھر در و دیوار سے بے خودی برس رہی تھی۔ جب یہ مصرعہ پڑھا کہ "میں خدا کس کو بناؤں جو خفا تو ہو جائے" تو ساری محفل پہ ایک مستی سی چھا گئی اور تو اور

استادانِ فن کی بھی یہ حالت تھی کہ بار بار شعر پڑھواتے، خود پڑھتے اور مزے لیتے تھے۔ ابھی ان کی تعریفیں ختم نہ ہوئی تھیں کہ شمع مرزا مجھلے المتخلص بہ قبول کے سامنے رکھی گئی۔ یہ نوجوان آدمی ہیں۔ مرزا کریم بخش مرحوم کے فرزند اور حضرت ظل سبحانی کے نواسے ہیں۔ ان کا کیا کہنا، زبان تو ان کے گھر کی لونڈی ہے۔ گا کر غزل پڑھتے ہیں۔ پڑھتے کیا ہیں جادو کرتے ہیں۔ ان کی غزل کے دو شعر لکھتا ہوں۔

اللہ رے جذبۂ دلِ مضطر کہ تیر کا — باہر ہمارے پہلو کے سوفار بھی نہیں
کچھ آپ ہی آپ دل یہ مرا بیٹھا جائے ہے — ظاہر میں تو الٰہی میں بیمار بھی نہیں،

دوسرے شعر میں الفاظ کیا بٹھائے ہیں، نگینے جڑ دیئے ہیں۔ آخر کیوں نہ ہو قلعہ کے رہنے والے ہیں۔

ان کے بعد سید ھی جانب سے شمع سرک کر لالہ بالمکند حضور کے سامنے آئی یہ ذات کے کھتری اور خواجہ میر درد کے شاگرد ہیں۔ کوئی ۷۰، ۸۰ برس کا سن ہے۔ سفید نورانی چہرہ اس پر سفید لباس، بغل میں انگوچھا، کندھوں پہ سفید کشمیری رومال بس جی چاہتا تھا کہ ان کو دیکھے ہی جائے۔ شمع سامنے آئی تو انہوں نے عذر کیا کہ میں اب سنانے کے قابل نہیں رہا، سننے کے قابل رہ گیا ہوں۔ جب سبھوں نے اصرار کیا تو انہوں نے یہ قطعہ پڑھا۔

نہ پاؤں میں جنبش نہ ہاتھوں میں طاقت — جو اُٹھ کھینچیں دامن، ہم اس دلربا کا
سرِ راہ بیٹھے ہیں اور یہ صدا ہے — کہ اللہ والی ہے بے دست و پا کا

قطعہ اس طرح پڑھا کہ خود تصویر ہو گئے۔ "نہ پاؤں میں طاقت" کہتے ہوئے اُٹھے مگر پاؤں نے یاری نہ کی لڑکھڑا کر بیٹھ گئے۔ "نہ ہاتھوں میں طاقت" کہہ کر ہاتھ اُٹھائے مگر ضعف سے وہ بھی کچھ یوں ہی سے اُٹھ کر رہ گئے۔ دوسرا مصرعہ ذرا تیز پڑھا، تیسرا مصرعہ پڑھتے وقت اس طرح بیٹھ گئے جیسے کوئی بے دست و پا سرِ راہ بیٹھ کر صدا

لگاتا ہے اور ایک دفعہ ہی دونوں آنکھوں کو آسمان کی طرف اُٹھاکر جو چوتھا مصرعہ پڑھا تو یہ معلوم ہوتا تھا گویا ساری مجلس پہ جادو کر دیا۔ ہر ایک کے منہ سے تعریف کی بجائے بے ساختہ یہی نکل گیا" کہ اللہ والی ہے بے دست و پا کا"! اُستاد ذوق نے کہا: "اُستاد یہ خدا کی دین اور خواجہ میر درد کا فیض ہے۔ سبحان اللہ! کیا موثر کلام ہے۔ ہم دنیاداروں میں یہ اثر پیدا ہونے کے لئے میر درد ہی جیسا اُستاد چاہیئے۔"

اس کلام کے بعد مرزا غلام محی الدین اشکی کی غزل بھلا کون سنتا۔ یہ شاہ عالم بادشاہ غازی کے پوتے ہیں۔ کوئی ۴۰ سال کی عمر ہے۔ اونچا قد، سفید پوشش، ثقہ صورت آدمی ہیں۔ پہلے نظام الدین ممنون سے اصلاح لیتے تھے۔ اب مفتی صدرالدین کے شاگرد ہو گئے ہیں لکھا تھا۔

کچھ وجہ نہیں نغمۂ مطرب ہی پہ موقوف — کافی ہے یہاں نالۂ بے ربط درا کا
سجدے میں گرے دیکھ کے تصویر بت اشکی — معلوم ہوا آپ کا خرقہ تھا ریا کا

ان کے بعد شمع صاحبزادہ عباس علی خان بیتاب کے سامنے آئی ۲۰۔ ۲۲ برس کا سن ہوگا۔ رام پور کے رہنے والے اور مومن خاں کے شاگرد ہیں۔ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ سے بڑی دوستی ہے۔ ان ہی کے ساتھ مشاعرہ میں آگئے تھے۔ بڑی اونچی آواز میں غزل پڑھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تحت اللفظ پڑھ رہے ہیں۔ غزل تو کچھ اچھی نہ تھی۔ مگر قطعہ ایسا تھا کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ مے خانے کی تقسیم ایسی خوبی سے کی تھی کہ سبحان اللہ۔ ہائے لکھا ہے۔

معمور ہے خدا کی عنایت سے مے کدہ — ساقی اگر نہیں ہے، نہ ہو مے سے کام ہے
بیتاب پی، خدا نے تجھے بھی دیئے ہیں ہاتھ — یہ خم ہے، یہ سبو ہے، یہ شیشہ، یہ جام ہے

بھلا ایسے بڑے مشاعرے میں مرزا فخرالدین حشمت کو پڑھنا کیا ضرور تھا نہ کلام ہی اچھا نہ پڑھنے کی طرز ہی اچھی۔ مگر ان کو روک کون سکتا تھا۔ شہزادے تھے اور وہ بھی

شاہ عالم بادشاہ کے پوتے۔ خیر پڑھ لیا اور بھائی ہندوں نے تعریفیں بھی کردیں خوش ہوگئے۔ غزل یہ تھی۔

ترے بیمار ہجراں کا ترے بن یہ عالم ہے کہ عالم نوحہ گر ہے
مجھے روتے جو دیکھا ہنس کے بولے مرے حشمت بتا کیوں چشم تر ہے

ہاں ان کے بعد جس کے سامنے شمع آئی وہ نوجوان سہی مگر شاعر ہے اور ایسا شاعر ہوگا کہ ہندوستان بھر میں نام کرے گا۔ بھلا کون مشاعرہ ہے جس میں مرزا قربان علی بیگ سالک کی غزل شوق سے نہیں سنی جاتی اور کون شعر ہوتا ہے جو بار بار نہیں پڑھوایا جاتا۔ جو ایک دفعہ بھی کسی مشاعرہ میں گیا ہے وہ ان کو دُور سے پہچان لے گا۔ چھوٹا ساقد، دبلے پتلے ہاتھ پاؤں، موٹی سی ناک چھوٹی چھوٹی آنکھیں، موٹی جلد، گندمی رنگ اس پر چیچک کے داغ، چھدری چھدری سی داڑھی، کلوں پر کم ٹھوڑی پہ ذرا زیادہ، سر پر خشخاشی بال کوئی ۳۰ سال کی عمر بس بخارا کے ترک معلوم ہوتے ہیں۔ ہاں لباس ان لوگوں سے مختلف ہے۔ نیچی چولی کا انگرکھا، تنگ مہری کا پاجامہ، سر پہ سفید گول ٹوپی، ہاتھ میں سفید نیلے کا رومال، شمع کا ان کے سامنے آنا تھا کہ سب سنبھل کر بیٹھ گئے۔ انھوں نے بھی انگرکھے کی آستین الٹ، ٹوپی کو اچھی طرح جما اپنے اُستاد مرزا غالب کی طرف دیکھا ادھر سے مسکرا کر کچھ اشارہ ہوا تو انھوں نے صاحب عالم کی طرف دیکھ کر عرض کی، "اجازت ہے۔" مرزا فخرو نے کہا: "ہاں میاں سالک پڑھو، آخر اس میں اجازت کی ضرورت ہی کیا ہے۔" سالک نے جیب میں سے کاغذ نکالا، کچھ اُلٹا پلٹا، پھر ایک بار سنبھل کر کہا: "عرض کیا ہے۔"

انتہا صبر آزمائی کی ہے درازی شبِ جدائی کی
ہے جُدائی نصیب کو مجھے تم سے اُمید ہے بھلائی کی

نقش ہے سنگ آستاں پہ ترے داستاں اپنی جبہ سائی کی
ہے فغاں بعد امتحانِ فغاں پھر شکایت ہے نارسائی کی
کیا نہ کرتا وصال شادیٔ مرگ تم نے کیوں مجھ سے بیوفائی کی
راز کھلتے گئے مرے سب پر جس قدر اس نے خود نمائی کی
کتنے عاجز ہیں ہم کہ پاتے ہیں بندے بندے میں بو خدائی کی
رہ گئیں دل میں حسرتیں سالکؔ آ گئی عمر پارسائی کی

ایک ایک شعر پہ یہ عالم تھا کہ محفل لوٹی جاتی تھی۔ ایک ایک شعر، کئی کئی بار پڑھوایا جاتا تھا۔ ایک ایک لفظ پہ تعریفیں ہوتیں اور ایک ایک بندش کی داد ملتی۔ اُستاد ذوقؔ نے تیسرے شعر پہ کہا "واہ میاں سالک کیا کہنا ہے، سب ہی جبہ سائی باندھتے آئے ہیں، تمہاری داستان کو کوئی نہیں پہنچا۔ کیا کلام ہے، کیا روانی ہے سبحان اللہ" حکیم مومن خاں نے کہا "میاں سالک یہ جوانی اور مقطع میں یہ بوڑھا مضمون، تمہاری "عمر پارسائی" کو بہت دن پڑے ہیں، ابھی سے تو بڈھوں کی سی باتیں نہ کیا کرو" میاں سالک نے جواب دیا، اُستاد میں تو جوانی ہی میں بڈھا ہو گیا، دیکھئے بڑھاپا دیکھنا نصیب بھی ہوتا ہے یا نہیں پھر دل میں آئے ہوئے مضمون کیوں چھوڑ دوں، بعد میں یہ کون دیکھتا پھرے گا کہ یہ شعر بڈھے نے کہا تھا یا جوان نے۔ ہم نہ رہیں گے مضمون رہ جائے گا"

جب تعریفوں کا سلسلہ ذرا رکا تو شمع مرزا رحیم الدین ایجادؔ کے سامنے آئی، یہ شہزادے مرزا حسین بخش کے صاحبزادے اور مولانا صہبائیؔ کے شاگرد ہیں کوئی ۲۴، ۲۵ سال کی عمر ہے۔ شعر کہتے ہیں مگر پھیکے۔ ہاں پڑھتے بڑی اچھی طرح ہیں۔ گانا خوب جانتے ہیں۔ ان کی آواز شعر کی کمزوری ظاہر ہونے نہیں دیتی۔

بت خانے میں تھا یا کہ میں کعبہ کے قریں تھا
اے زاہد ناداں تجھے کیا ہے میں کہیں تھا
ہر چند کہ میں دوست کے ہمراہ نہیں تھا
پر دل وہ بلا ہے، وہ جہاں تھا یہ وہیں تھا
توڑا ہے یہ کچھ آپ کو میں مے کو جہاں میں
ثابت نہ رہا نام کا جو میرے نگیں تھا

غزل میں تو کیا خاک مزا آتا ہاں ان کے گانے میں مزا آگیا۔ گاکر پڑھنے کا یہ نیا رنگ قلعہ سے چلا ہے، مگر اُستادانِ فن اس کو پسند نہیں کرتے۔

ان کے بعد شمع نواب علاء الدین خاں علائیؔ، کے سامنے آئی۔ انہوں نے بہت اونچی آواز میں اپنی غزل سنائی۔ علائیؔ مرزا غالب کے بڑے چہیتے شاگرد ہیں، ابھی نو عمر ہیں، بڑے ہو کر اچھے شاعر نکلیں گے۔

شمع کا سامنے رکھنا تھا کہ مرزا کریم الدین رساؔ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ایک بڑی لمبی غزل پڑھی مگر ساری کی ساری بے مزہ، نہ الفاظ کی بندش اچھی نہ مضامین میں کوئی خوبی، تعقید دل سے اُلجھن پیدا ہوتی تھی اور رعایت لفظی سے جی گھبراتا تھا۔ ان کے بس دو ہی شعر نمونے کے طور پر لکھ دینا کافی سمجھتا ہوں۔

باز آ، ستا تجھ کو بہت عشوہ گر نہیں — کرنا کسی پہ ظلم کوئی اس قدر نہیں
گو نزع میں ہوں میں ترے بن تیرے جانِ من — کرنے کی جان بھی مرے تن سے سفر نہیں

یہ پڑھ چکے تو نواب ضیاء الدین خاں نیرؔ درخشاں کے پڑھنے کی باری آئی۔ فارسی کے شعر خوب کہتے ہیں، اردو کی غزلیں ذرا پھیکی ہوتی ہیں، لکھا تھا۔

جی کے گرنے کا ہے خیال ہمیں — ساقیا تجھ کو سنبھال ہمیں
شب نہ آئے جو اپنے وعدے پر — گزرے کیا کیا نہ احتمال ہمیں

دل میں مضمر ہیں معنی باقی ، کسی صورت نہیں زوال ہمیں
تیرے غصے نے ایک دم میں کیا مردۂ نہ ہزار سال ہمیں
طالعِ بد سے نیّرِ رخشاں اپنے ہی گھر میں ہے وبال ہمیں

ان کے بعد شمع مرزا پیارے رفعتؔ کے سامنے آئی۔ یہ سلاطین زادے ہیں بٹیریں لڑانے کا بڑا شوق ہے۔ شعر بھی خوب کہتے ہیں، پڑھتے بھی خوب ہیں، پہلے احسان کے شاگرد تھے اب مولانا صہبائی سے تلمذ ہے۔ کوئی بہ سال کی عمر ہوگی لکھا تھا۔

بیانِ طائرِ رنگِ پریدہ وحشت سے کسے دماغ ہے اب آشیاں بنانے کا
نہ عذر تھا ہمیں ہونے میں خاک کے، گر ہم یہ جانتے کہ وہ دامن نہیں بچانے کا
گندھی تھی کون سے بدستِ تشنہ لب کی وہ خاک کہ جس سے خم یہ بنا ہے شرابخانے کا
بذوق یار کو دے رخصتِ جفا کر یہاں ہمیں بھی عزم ہے طاقت کے آزمانے کا
ہیں ایک وہ بھی کہ تم سے ہے جن کو راز و نیاز اور ایک ہم ہیں کہ تکتے ہیں منہ زمانے کا

آخری شعر میں مایوسی کی جو تصویر کھنچی ہے اس کی تعریف نہیں ہو سکتی کوئی نہ تھا جو اس شعر کے دوسرے مصرعے کو پڑھ پڑھ کر نہ جھومتا ہو اور بار بار واہ واہ اور سبحان اللہ نہ کہتا ہو۔ ہوتے ہوتے میاں عارفؔ کا نمبر آ ہی گیا۔ بھلا ان کو مشاعرے کے انتظام سے کب فرصت تھی جو غزل لکھتے۔ پھر بھی چلتے پھرتے کچھ لکھ ہی لیا تھا، وہی پڑھ دیا۔ اس دن رات کی گردش کے بعد اتنا بھی لکھ لینا کمال ہے۔ غزل تھی۔

اُٹھتا جو قدم آگے کو اے نامہ بر نہیں پیچھے تو چھوڑ آئے کہیں اس کا گھر نہیں
اور دل کو ہو تو ہو، ہمیں مرنے سے ڈر نہیں خط لیکے ہم ہی جاتے ہیں گر نامہ بر نہیں
بے التفاتیوں کا ترے شکوہ کیا کریں اپنے ہی جب کہ نامۂ دل میں اثر نہیں

مطلع کی سب نے تعریف کی۔ اُستاد احسان نے کہا "میاں عارف! میں بھی شعر کہتے کہتے بڈھا ہو گیا ہوں، لاکھوں شعر سُنے، لاکھوں سُنائے، مگر یہ مضمون بالکل نیا ہے اور کس خوبی سے ادا کیا ہے کہ دل خوش ہو گیا۔" میاں عارف کے بعد شمع مرزا غلام نصیر الدین عرف مرزا منجھلے کے سامنے آئی۔ یہ شہزادے ہیں۔ احسان کے شاگرد ہیں اور قناعت تخلص کرتے ہیں۔ غزل خاصی کہتے ہیں۔ میں تو یہی کہوں گا کہ شہزادوں میں بہت کم ایسے شاعر ہوں گے۔ غزل تھی۔

شوق کو کثرتِ نظارہ سے رشک آتا ہے
حشر سے پہلے میسر ہو وہ دیدار مجھے

کعبے تک جانے میں تھی خاطرِ زاہد ورنہ
دیر میں بھی تھی سدا رخصتِ دیدار مجھے

جنسِ نادیدہ کی مانند ہے اٹھا دئیں جان
کہ نہ لیتا ہے نہ پھیرے ہے خریدار مجھے

رازِ دل لب پہ نہ لانا کبھی منصور، کہ یاں
کر دیا بات کے کہنے نے گنہگار مجھے

شمع کا حکیم آغا جان عیش کے سامنے آنا تھا کہ لوگوں میں سرگوشیاں شروع ہوئیں۔ حکیم صاحب بادشاہی اور خاندانی طبیب ہیں۔ زیورِ علم سے آراستہ اور لباسِ کمال سے پیراستہ، صاحبِ اخلاق، خوش مزاج، شیریں کلام، شگفتہ صورت جب دیکھو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسکرا رہے ہیں۔ طبیعت ایسی ظریف و لطیف اور لطیفہ سنج پائی ہے کہ سبحان اللہ میانہ قد، خوش اندام، سر پہ ایک ایک انگل بال سفید، ایسی ہی داڑھی اس گوری سرخ و سفید رنگت پر کیا بھلی معلوم ہوتی ہے۔ گلے میں ململ کا کرتہ جیسے چنبیلی کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہے۔ مگر کچھ دنوں سے ان کے دوست بھی ان سے ذرا کھنچ گئے تھے۔ میاں ہدہد کو پال کر انہوں نے سب سے بگاڑ لی۔ شروع شروع میں تو اس کی واہی تباہی باتوں پہ کسی نے دھیان نہیں کیا، لیکن جب اس نے اُستادوں پہ حملے شروع کئے اس وقت سے ہدہد کے ساتھ ہی حکیم صاحب سے بھی لوگوں کو کچھ نفرت سی ہو گئی۔ غضب

یہ کیا کہ اجمیری دروازے والے مشاعرے میں خود انھوں نے مرزا نوشہ پر کھلا ہوا حملہ کر دیا۔ ایک قطعہ لکھا تھا کہ۔

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے

کلام میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

مولوی مملوک العلی نے کہا "حکیم صاحب، شعر کے سمجھ میں نہ آنے کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو شعر ہی بے معنی ہے یا سمجھنے والے کے دماغ کا قصور ہے۔ ہم سب تو ان کے شعر سمجھتے ہیں، پھر آپ نے ہم غریبوں کو کیوں لپیٹ لیا۔" مومن خاں نے کہا "بھئی مجھے تو اس قطعے کے تیسرے مصرعے میں بھی شاعرانہ تعلّی معلوم ہوتی ہے۔" بہر حال بڑی مشکل سے معاملہ رفع دفع ہوا۔ اس معرکے کے بعد یہ دوسرا موقع تھا کہ حکیم صاحب مشاعرے میں تشریف لائے تھے۔ میر صاحب نے ہدہد کے مقابلے میں جو اعلان جنگ کیا تھا وہ سن چکے تھے۔ اب لوگوں میں جو کانا پھوسی ہونے لگی اس سے اور بھی پریشان ہوئے پڑھنے میں تامل کیا۔ آخر مرزا فخرو کے اصرار پر یہ غزل پڑھی۔

صلح اُن سے ہمیں کئے ہی بنی
دل یہ جھگڑا تھا دل دیئے ہی بنی

زہد و تقوے دھرے رہے سارے
ہاتھ سے اُس کے مے پیئے ہی بنی

لائے وہ ساتھ غیر کو، ناچار
پاس اپنے بٹھالئے ہی بنی

کس کا تھا پاسِ شوق ظلم اے عیش
ان جفاؤں پہ بھی جیئے ہی بنی

جب ایسی غزل ہو تو بھلا کون تعریف نہ کرے۔ صلّ علیٰ کے شور اور سبحان اللہ کی آوازوں نے پڑھنے والے اور سننے والوں دونوں کے دلوں سے غبار کدورت دور کر دیا اور حکیم صاحب وہی حکیم صاحب ہو گئے جو پہلے تھے۔ نہ ان سے کسی کو رنج رہا اور نہ ان کو کسی سے ملال، ہاں اگر پہلے کہیں میاں ہدہد

کچھ چرک جاتے تو خدا معلوم مشاعرے کا کیا رنگ ہو جاتا۔ وہ تو خدا بھلا کرے۔ ہمارے میر صاحب کا انہوں نے پہلے ہی اس بکھیڑ کی زبان بند کر دی۔ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت۔

حکیم صاحب کے بعد مرزا رحیم الدین حیاؔ کا نمبر آیا۔ یہ وہی میاں حیا ہیں۔ جن کی تعریف مشاعرے میں آتے ہی ان کے والد صاحب قبلہ مرزا کریم الدین رسا نے فرمائی تھی۔ بڑے خوش طبع، ذہین، نیک فطرت، بدیہہ گو اور ظریف آدمی ہیں کوئی ۳۵، ۳۶ سال کی عمر ہے۔ اکثر بنارس میں رہتے ہیں، کبھی کبھی دہلی چلے آتے ہیں۔ شکل تو بالکل شہزادوں کی ہے۔ مگر داڑھی منڈی ہوئی اور لباس لکھنؤ والوں کا ہے۔ پہلے اپنے والد کے شاگرد ہوئے، پھر شاہ نصیر سے اصلاح لی، اب اپنا کلام استاد ذوق کو دکھاتے ہیں۔ شطرنج بے مثل کھیلتے ہیں پہلے حکیم شرافت علی خاں سے سیکھی اب مومن خان کو گھیرے رہتے ہیں۔ ستار ایسا بجاتے ہیں کہ سبحان اللہ۔ شاعر بھی اچھے ہیں، مگر محنت نہیں کرتے، زبان کی چاشنی پر مضمون کو نثار کر دیتے ہیں یہ غزل لکھ کر لائے تھے۔

موت ہی چارہ سازِ فرقت ہے رنج مرنے کا مجھ کو راحت ہے
ہو چکا وصل، وقتِ رخصت ہے اے اجل جلد آ کہ فرصت ہے
روز کی داد کون دیوے گا ظلم کرنا تمہاری عادت ہے
کارواں عمر کا ہے رخت بدوش ہر نفس بانگِ کوس رحلت ہے
سانس اک پھانس سی کھٹکتی ہے دم نکلتا نہیں، مصیبت ہے
تم بھی اپنے حیا کو دیکھ آؤ آج اس کی کچھ اور حالت ہے

پانچویں شعر پر ان کے والد نے ٹوکا اور کہا "میاں حیا! لکھنؤ جا کر اپنی شکل تو بدل آئے تھے۔ اب زبان بھی بدل دی، سانس کو مونث باندھ گئے۔"

حیانے جواب دیا "جی نہیں قبلہ، میں نے تو اُستاد ذوق کی تقلید کی ہے، وہ فرماتے ہیں ؎

"سینے میں سانس ہو گی اڑی دو گھڑی کے بعد"

بھلا صاحبِ عالم[*] کب چوکنے والے تھے کہنے لگے "بھلا ہمارے مقابلے میں آپ کے اُستاد کا کلام کہیں سند ہو سکتا ہے، وہ جو چاہیں لکھیں، یہ بتاؤ قلعے میں سانس مذکر ہے یا مونث" بچارے حیا مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

اب شمع مولانا صہبائی کے روبرو آئی۔ ان کی علمیت کا ڈنکا تمام ہندوستان میں بج رہا ہے۔ ایسے جامع الکمال آدمی کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ ہزاروں شاگرد ہیں اکثر ریختہ کہتے ہیں، ان کو اصلاح دیتے ہیں اور خوب دیتے ہیں، مگر خود ان کا کلام تمام و کمال فارسی ہے۔ میں نے تو ریختے میں نہ کبھی ان کی کوئی غزل دیکھی نہ سُنی، اور مشاعرے میں بھی فارسی ہی کی غزل پڑھی۔ خوب خوب تعریفیں ہوئیں مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ لوگوں کو مزہ نہ آیا۔

ہمچو شبنم خویش را فارغ نہ عالم ساختم	محرم خورشید گشتم با خساں کم ساختم
مردم و در چشم مردم عالمے تاریک گشت	من مگر شمعم چو رفتم بزم بہ ہم ساختم
کفر در کیشم سپاس نعمتِ دیدار داست	جلوہ در ہر رنگ دیدم گردنے خم ساختم
جرم عشقم را جزا شد حور و من از ہجر دوست	داغ بہ دل بُردم و خلدش جہنم ساختم
نیست صہبائی چو جامِ جم نصیبم گو مباد	مے ز خونِ دل کشیدم خویش را جم ساختم

مقطع پر تو اتنی تعریفیں ہوئیں کہ بیان سے باہر ہے۔ مگر جو بچارے فارسی

---

[*] قلعے والوں کو خواہ وہ شہزادے ہوں یا سلاطین زادے، صاحبِ عالم کہا جاتا ہے۔

نہیں سمجھتے تھے وہ بیٹھے منہ دیکھا کئے۔ صاف بات تو یہ ہے کہ اُردو کے مشاعرے میں فارسی کا پڑھنا سننا کچھ مجھے بھی پسند نہ آیا۔

اہا ہاہا! زبان کا لطف اُٹھانا ہے تو اب سید ظہیر الدین حسین خاں ظہیر کو سُنیئے۔ ابھی ۳۰، ۳۲، ۳۳ سال کی عمر ہے مگر کلام میں خدا نے وہ اثر دیا ہے کہ واہ واہ، اُستاد ذوق کی اصلاح نے اور سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔ شکل و صورت سے یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ ان کی طبیعت اس بلا کی ہے۔ قد خاصہ اونچا، چھریرا بدن، کشادہ سینہ، سانولی رنگت، کشادہ دہن، اونچی ستواں ناک، آنکھیں نہ بہت بڑی نہ بہت چھوٹی، مگر روشن، گول ڈاڑھی نہ بہت گھنی نہ بہت چھدری، سر پر پٹھے، لباس میں انگرکھا، تنگ مہری کا سفید پاجامہ، سر پر سفید گول ٹوپی، خوش مزاج اور لطیفہ سنج ایسے کہ مُنہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ پڑھنے کا بھی ایک خاص طرز ہے۔ لکھنؤ والوں کے تحت اللفظ پڑھنے سے ملتا جلتا ہے، ساتھ ہی اشاروں سے ایک ایک لفظ کو سمجھاتے جاتے ہیں۔ غزل ہوئی تھی۔

جبیں اور شوق اس کے آستاں کا ... ارادہ اور ارادہ بھی کہاں کا
لٹا ہے قافلہ تاب و تواں کا ... خدا حافظ ہے دل کے کارواں کا
مری واماندگی منزل رساں ہے ... سُراغ نقشِ پا ہوں کارواں کا
ہے پابند دل کے دل میں ارماں ... قدم منزل نے پکڑا کارواں کا
اُٹھا سکتے نہیں سر آستاں سے ... غضب ہے بارِ منت پاسباں کا
ہمیشہ موردِ برق و بلا ہوں ... مٹے جھگڑا الٰہی آشیاں کا
دلِ بیتاب نے وہ بھی مٹایا ... کسی کو کچھ جو دھوکا تھا فغاں کا

ظہیر! آؤ چلو اب میکدے کو　　نکالا زہد و تقویٰ ہے کہاں کا

اور تو اور استادانِ فن نے اس غزل کی ایسی داد دی کہ میاں ظہیر کا دل غنچے کی طرح کھل گیا۔ تیسرے شعر پر تو یہ حالت تھی کہ تعریفوں کا سلسلہ ختم ہی نہ ہوتا تھا۔ سلام کرتے کرتے بچارے کے ہاتھ دُکھ گئے ہوں گے۔ جب ذرا سکون ہوا تو سیدھی جانب کی شمع نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے سامنے آئی۔ ان کا کیا کہنا۔ استادانِ فن میں شمار کئے جاتے ہیں مومن کے شاگرد ہیں مگر خود استاد ہیں۔ انہوں نے کسی شعر کی تعریف کی اور اُس کی وقعت بڑھی، یہ سُن کر ذرا خاموش ہوئے اور شعر دوسروں کی نظروں سے بھی گر گیا۔ زبان کے ساتھ مضمون کو ترتیب دینا ایسے ہی لوگوں کا کام ہے۔ پڑھتے بھی ہیں تو ایک ایک لفظ سمجھا سمجھا کر۔ آواز ایسی اُونچی ہے کہ دور اور پاس سب کو صاف سنائی دے۔ غزل پڑھنے سے پہلے اِدھر اُدھر دیکھا، ذرا انگرکھا درست کیا، ٹوپی درست کی انگرکھا کی آستینوں کو چڑھایا اور یہ غزل پڑھی۔

آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں　　گل سینہ چاک ہیں اور صبا اضطراب میں

سب اس میں محو اور یہ سب سے علاحدہ　　آئینہ میں ہے آب نہ آئینہ آب میں

معنی کی فکر چاہیے صورت سے کیا حصول　　کیا فائدہ ہے موج اگر ہے شراب میں

ذات و صفات میں بھی یہی ربط چاہیے　　جوں آفتاب روشنیِ آفتاب میں

وہ قطرہ ہوں کہ موجۂ دریا میں گم ہوا　　وہ سایہ ہوں کہ محو ہوا آفتاب میں

بیباک خیوہ، شوخ طبیعت، زباں دراز　　ملزم ہوا ہے پر نہیں عاجز جواب میں

تکلیف شیفتہ ہوئی تم کو مگر حضور　　اس وقت اتفاق سے وہ ہیں عتاب میں

غزل تو ایسی ہے کہ بھلا کس کا منہ ہے جو تعریف کا حق ادا کر سکے، مگر تعریف بڑی سنبھل سنبھل کر کی گئی۔ بڑے مشاعروں میں میں نے ہمیشہ یہ دیکھا کہ نو مشقوں کے دل تو تعریفوں سے خوب بڑھاتے ہیں مگر جب استادوں کے پڑھنے کی نوبت آتی ہے۔ تو وہ جوش و خروش نہیں رہتا، بلکہ جوش کے بجائے متانت زیادہ آجاتی ہے۔ استادوں کے اُن ہی شعروں کی تعریف ہوتی ہے جو واقعی تعریف کے قابل ہوں اگر کسی شعر کی ذرا بے جا تعریف کر دی جائے تو ان سے ان کو تکلیف ہوتی ہے۔ یہ صرف اسی کلام کی تعریف چاہتے ہیں جس کو یہ خود سمجھتے ہیں کہ اس کی تعریف ہونی چاہیئے۔ شعر پڑھ کر اگر دیکھتے بھی ہیں تو اپنے برابر والوں کی طرف اور وہی داد بھی دیتے ہیں، مشاعرے کے باقی لوگ ان کے کلام سے لطف ہی نہیں اُٹھاتے، کچھ حاصل بھی کر لیتے ہیں، ان کے لئے یہ غزلیں کسی طرح استاد کی اصلاح سے کم نہیں ہوتیں۔

اُن کے بعد شہزادہ مرزا قادر بخش صابر کی باری آئی یہ کوئی ۲۸ برس کے ہوں گے۔ اُن کی شاعری کی قلعہ میں بڑی دھوم ہے۔ خود ان کو بھی اپنے کلام پہ ناز ہے۔ شعرائے دہلی کا ایک تذکرہ لکھ رہے ہیں مگر مشہور یہ ہے کہ الف سے لیکر ی تک مولانا صہبائی کا قلم ہے، یہ سچ ہے یا جھوٹ خدا بہتر جانتا ہے۔ خود انہوں نے اپنے خیالات ایک قطعہ میں لکھے ہیں وہ نقل کرتا ہوں قطعہ

پہلے استاد تھے احساںؔ و نصیرؔ و مومنؔ
ہوئی احساںؔ سے یہ اصلاح طبیعت میری
پھر ہوا حضرت صہبائی کی اصلاح کا فیض
طبع باریک ہوئی اُن کی بدولت میری

اور ہم بزم رہے مومن و ذوق و غالب
اوستادوں ہی سے ہر دم رہی صحبت میری
ہند کا فضل و ہنر ذات پہ ہے جن کے تمام
مانتے ہیں وہی اشخاص فضیلت میری
منعقد ہوتی ہے جب شہر میں بزم نشاط
کرتے ہیں اہل سخن وقعت و عزت میری

اب اس کلام پر ان کو اُستا کہو یا جو جی چاہے کہو۔ غزل میں بھی یہی پھیکا رنگ، مضمون بھی کچھ بلند پایہ نہیں ہیں مگر سارا شہر ان کو اُستاد مانتا ہے ہوں گے ممکن ہے میری ہی سمجھ کا پھیر ہو، غزل کہی تھی.

نظارہ برق حسن کا دشوار ہو گیا — جلوہ حجاب دیدۂ بیدار ہو گیا
محفل میں ہیں تو اُس لب میگوں کے سامنے — نام شراب لے کے گنہگار ہو گیا
حائل ہوئی نقاب تو بھڑکی نگاہ شوق — پردہ ہی جلوہ گاہ رخ یار ہو گیا
معلوم یہ ہوا کہ ہے پرسش گناہ کی — عاصی گنہ نکردہ گنہگار ہو گیا
اُس کی گلی میں آن کے کیا کیا اُٹھائے رنج — خاک شفا ملی تو میں بیمار ہو گیا
پیری میں ہم کو قطع تعلق ہوا نصیب — قامت خمیدہ ہوتے ہی تلوار ہو گیا

یہ پڑھ چکے تو شمع مفتی صدر الدین صاحب آزردہ کے سامنے پہنچی اس پائے کے عالم شاعر نہیں ہوتے اور ہوتے ہیں تو اُستاد ہو جاتے ہیں۔ مفتی صاحب کے جتنے شاگرد جیّد عالم ہیں اُس سے کہیں زیادہ ان کے تلامذہ شاعر ہیں اور شاعر بھی کیسے کہ بڑے پائے کے مفتی صاحب کہتے تو خوب

ہیں مگر پڑھتے اس طرح ہیں گویا طالب علموں کو سبق دے رہے ہیں۔ آواز ذرا نیچی ہے لیکن اُن کی وجاہت کا یہ اثر ہے کہ مشاعرے میں سناٹا ہوتا ہے اور تعریف بھی ہوتی ہے تو خاص خاص شعروں پر اور بہت نیچی آواز میں۔ ہاں مرزا نوشہ ان سے مذاق کرنے میں نہیں چوکتے۔ کبھی کبھی اعتراض بھی کر بیٹھتے ہیں اور مزے مزے کی نوک جھونک ہو جاتی ہے۔ غزل ملاحظہ ہو کیا پختہ کلام ہے۔

باتوں سے میرے کب تہ و بالا جہاں نہیں
کب آسماں زمین و زمیں آسماں نہیں

افسردہ دل نہ ہو در رحمت نہیں ہے بند
کس دن کھلا ہوا درِ پیر مغاں نہیں

شب اُس کا حال دل نے جتایا کچھ اس طرح
ہیں لب تو کیا نگہ بھی ہوئی ترجماں نہیں

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

کٹتی کسی طرح بھی نہیں یہ شبِ فراق
شاید کہ گردش آج تجھے آسماں نہیں

کہتا ہوں اُس سے کچھ میں نکلتا ہے منہ سے کچھ
کہنے کو یوں تو ہے گی زباں اور زباں نہیں

آزردہ ہونٹ تک نہ ہلے اُس کے روبرو
مانا کہ آپ سا کوئی جادو بیاں نہیں

آزردہ جیسے اُستاد کے بعد نواب مرزا خان داغ کا پڑھنا ایک عجیب سی چیز ہے مگر بات یہ ہے کہ اوّل تو داغ کو سب چاہتے ہیں، دل بڑھاتے ہیں اور جانتے ہیں کہ کسی دن یہی داغ ہندوستان کا چراغ ہوگا۔ دوسرے مرزا فخرو کے خیال سے ان کو اُستادوں میں جگہ ملی تھی مگر انھوں نے غزل بھی ایسی پڑھی کہ استاد بھی قائل ہو گئے، ۱۷، ۱۸ برس کے لڑکے کا اس قیامت کی غزل اور اس جرأت سے پڑھنا واقعی کمال ہے۔ میری تو رائے ہے کہ جو زبان داغ نے لکھی ہے وہ شائد ہی کسی کو نصیب ہوگی ذرا زبان کی شوخی، مضمون کی رنگینی اور طبیعت کی روانی ملاحظہ کیجئے اور داد دیجئے۔

سامنے یہ کینہ ساز کیا جانیں — ناز والے نیاز کیا جانیں
شمع رو آپ گو ہوئے لیکن — لطف سوز و گداز کیا جانیں
کب کسی در کی جبہ سائی کی — شیخ صاحب نماز کیا جانیں
جو رہِ عشق میں قدم رکھیں — وہ نشیب و فراز کیا جانیں
پوچھئے میکشوں سے لطف شراب — یہ مزا پاکباز کیا جانیں
جن کو اپنی خبر نہیں اب تک — وہ مرے دل کا راز کیا جانیں
حضرت خضر جب شہید نہ ہوں — لطفِ عمرِ دراز کیا جانیں
جو گزرتے ہیں داغ پر صدمے — آپ بندہ نواز کیا جانیں

اللہ اللہ! وہ سہانا وقت، وہ چھوٹی سی آواز، وہ دلکش سرِ وہ الفاظ کی نشست، وہ بندش کی خوبصورتی اور سب سے زیادہ یہ کہ وہ داغ کی

بھولی بھالی شکل، ایک عجیب لطف دے رہی تھی۔ ساری محفل میں کوئی نہ تھا جو محوِ حیرت نہ ہو گیا ہو اور کوئی نہ تھا جس کے منہ سے جز اللہ اللہ، سبحان اللہ اور صلِ علیٰ کے الفاظ بیساختہ نہ نکل رہے ہوں، مرزا فخرو کی تو یہ حالت تھی کہ گھڑی گھڑی پہلو بدلتے اور دل ہی دل میں خوش ہوتے تھے۔ غزل ختم ہوئی اور کسی کو معلوم نہ ہُوا کہ کب ختم ہو گئی۔ جب شمع حکیم مومن خاں مومن کے سامنے پہنچ گئی اس وقت لوگوں کا جوش کم ہوا اور اس ریختے کے اُستاد کا کلام سننے کو سب ہمہ تن گوش ہو گئے۔ انھوں نے شمع کو اُٹھا کر ذرا آگے رکھا ذرا سنبھل کر بیٹھے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کی، ٹوپی کو کچھ ترچھا کیا، آستینوں کی چینٹ کو صاف کیا، اور بڑی دردانگیز آواز میں دل پذیر ترنم کے ساتھ یہ غزل پڑھی۔

اُلٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ
بے طاقتی کے طعنے ہیں عذرِ جفا کے ساتھ
بہرِ عیادت آئے وہ لیکن قضا کے ساتھ
دم ہی نکل گیا مرا آوازِ پا کے ساتھ
مانگا کریں گے اب سے دعا ہجرِ یار کی
آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ
ہے کس کا انتظار کہ خوابِ عدم سے بھی
ہر بار چونک پڑتے ہیں آوازِ پا کے ساتھ
سو زندگی نثار کروں ایسی موت پر
یوں روئے زار زار تو اہلِ عزا کے ساتھ

بے پردہ غیر پاس اسے بیٹھا نہ دیکھتے۔

اُٹھ جاتے کاش ہم بھی جہاں سے حیا کے ساتھ

اس کی گلی کہاں، یہ تو کچھ باغ خلد ہے

کس جائے مجھ کو چھوڑ گئی موت لاکے ساتھ

اللہ رے گمرہی، بت و بت خانہ چھوڑ کر

مومن چلا ہے کعبے کو اک پارسا کے ساتھ

شاعری کیا تھی، جادو تھا، تمام لوگ ایک عالم محویت میں بیٹھے تھے وہ خود بھی اپنے کلام کا مزا لے رہے تھے جس شعر میں ان کو زیادہ لطف آتا تھا اُس کے پڑھتے وقت ان کی اُنگلیاں زیادہ تیزی سے بالوں میں چلنے لگتی تھیں۔ بہت جوش ہوا تو کاکلوں کو اُنگلیوں میں بل دے کر مروڑ لیے۔ کسی نے تعریف کی تو گردن جھکا کر ذرا مسکرا دیئے پڑھنے کا طرز بھی سب سے جدا تھا، ہاتھ بہت ہلاتے تھے اور ہلاتے بھی کیسے، ہاتھوں کو بالوں سے کب فرصت تھی۔ ہاں آواز کے زیر و بم اور آنکھوں کے اشاروں سے جادو سا کر جاتے تھے۔ غزل ختم ہوئی تو تمام شعرا نے تعریف کی۔ سُن کر مسکرائے اور کہا: "آپ لوگوں کی یہی عنایت تو ہماری ساری محنت کا صلہ ہے، میں تو عرض کر چکا ہوں۔

ہم داد کے خواہاں ہیں نہیں طالب زر کچھ

تحسین سخن فہم ہے مومن صلہ اپنا

ان کے بعد شیخ اُستاد احسان کے سامنے آئی۔ میں سمجھا تھا کہ ان کی

آواز کیا خاک نکلے گی مگر شمع کے پہنچتے ہی وہ تو بجلی سی بدل کچھ سے کچھ ہو گئے اور اتنی بلند آواز سے غزل پڑھی کہ تمام مجلس پر چھا گئے۔ کسی شعر پہ مومن خاں کو متوجہ کرتے، کسی پہ مرزا نوشہ کو، کسی پہ اُستاد ذوق کو ان کی عظمت کچھ لوگوں کے دلوں پہ ایسی چھائی ہوئی تھی کہ جس کو انہوں نے متوجہ کیا اُس کو تعریف ہی کرتے بن پڑی۔ ردیف سخت اور قافیہ مشکل تھا۔ مگر ان کی اُستادی کی داد دینی چاہیئے کہ ان دشواریوں پہ بھی ساری کی ساری غزل مرصع کہہ گئے ہیں ہائے لکھتے ہیں۔

تو کیوں ہے گریہ کناں، اے مرے دلِ محزوں
نہ رو نہ رو کہ نہ تجھ کو کبھی رولائے خدا
بتو! بتاؤ تو، کیا تم خدا کو دوگے جواب
خدا کے بندوں پہ یہ ظلم، بندہ ہائے خدا
رضا پہ تیری ہوں دن رات اے صنم مصروف
جو اس پہ تو نہیں راضی، نہ ہو رضائے خدا
بتوں کے کوچے میں کہتا تھا کل یہی احساں
یہاں کسی کا نہیں ہے کوئی سوائے خدا

جب یہ پڑھ چکے تو مرزا غالب کی باری آئی تو یہ رنگ ہی دوسرا تھا صبح ہو چلی تھی شمع کے سامنے آتے ہی فرمانے لگے۔

"صاحبو! میں بھی اپنی بھیرویں الاپتا ہوں" یہ کہہ کر ایسے دل کش اور مؤثر لہجے میں غزل پڑھی کہ ساری محفل محو ہو گئی آواز بہت اونچی اور رسیلی تھی۔

یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا مجلس میں کسی کو اپنا قدر داں نہیں پاتے اس لئے غزل خوانی میں فریاد کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ غزل تھی۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے ۔۔۔ آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار ۔۔۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں ۔۔۔ کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود ۔۔۔ پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں ۔۔۔ غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے ۔۔۔ نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ۔۔۔ ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

ہم کو اُن سے وفا کی ہے امید ۔۔۔ جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

ہاں بھلا کر: ترا بھلا ہو گا ۔۔۔ اور درویش کی صدا کیا ہے

جان تم پر نثار کرتا ہوں ۔۔۔ میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ ۔۔۔ مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

غزل پڑھ کر مسکرائے اور کہا" اس پر بھی نہ سمجھیں وہ تو پھر ان سے خدا سمجھے" حکیم آغا خان جان سمجھ گئے اور کہنے لگے "مرزا صاحب! غنیمت ہے کہ تم اس رنگ کو آخر ذرا سمجھے" غرض تعریفوں کے ساتھ ساتھ مذاق بھی ہوتا رہا اور شمع اُستاد ذوق کے سامنے پہنچ گئی۔ اُستاد نے مرزا فخرو کی طرف دیکھ کر کہا" صاحب عالم غزل پڑھوں یا کل جو قطعہ ہوا ہے وہ عرض کروں کل رات خدا جانے کیا بات تھی کہ کسی طرح نیند ہی نہ آتی تھی۔

لوٹتے لوٹتے صبح ہوگئی، شب ہجر کا مزا آگیا۔ اسی کش مکش میں ایک قطعہ ہوگیا ہے اجازت ہو تو عرض کروں؟" مرزا فخرو نے کہا۔ "اُستاد آج کا مشاعرہ سب بندوں سے آزاد ہے۔ غزل پڑھیئے، رباعی پڑھیئے، قصیدہ پڑھیئے، قطعہ پڑھیئے غرض جو دل چاہے پڑھیئے، ہاں کچھ نہ کچھ پڑھیئے ضرور۔" استاد ذوق سنبھل کر بیٹھ گئے۔ اور یہ قطعہ ایسی بلند اور خوش آیند آواز میں پڑھا کہ محفل گونج اُٹھی اور اُن کے پڑھنے کے انداز نے کلام کی تاثیر میں اور زیادہ زور پیدا کر دیا۔

کہوں کیا ذوقؔ احوالِ شبِ ہجر — کہ تھی اک اک گھڑی سو سو مہینے
نہ تھی شب ڈال رکھا تھا اک اندھیر — مرے بختِ سیہ کی تیرگی نے
تپِ غم شمع ساں ہوتی نہ تھی کم — اور آتے تھے پسینوں پہ پسینے،
یہی کہتا تھا گھبرا کر فلک سے — کہ او بے مہر بد اختر کمینے
کہاں میں اور کہاں یہ شب، مگر تھے — مری جانب سے تیرے دل میں کینے
سو اس ظلمت کے پردے میں کئے ظلم — ارے ظالم تری کینہ وری نے
عوض کس بادہ نوشی کے مجھے آج — پڑے یہ زہر کے سے گھونٹ پینے
حواس و ہوش جو مجھ سے قریں تھے — قرینے سے ہوئے سب بے قرینے
مری سینہ زنی کا شور سُن کر — پھٹے جاتے تھے ہمسایوں کے سینے
اُٹھایا گاہ اور گاہے بٹھایا — مجھے بیتابی و بے طاقتی نے
کہا جب دل نے تو کچھ کھا کے سو رہ — بہت الماس کے توڑے نگینے
نہ ٹوٹا جان کا قالب سے رشتہ — بہت سی جان توڑی جاں کنی نے

بہت دیکھا نہ دکھلایا ذرا بھی — طلوع صبح سے منہ رُوشنی نے
کہا جی نے مجھے یہ ہجر کی رات — یقیں ہے صبح تک دے آج جینے
لگے پانی چوانے منہ میں آکر — پڑھی یاسین سرہانے کسی نے
مگر دن عمر کے تھوڑے سے باقی — لگا رکھے تھے میری زندگی نے
کہ قسمت سے قریب خانہ میرے — اذاں مسجد میں دی بارے کسی نے
بشارت مجھ کو صبح وصل کی دی — اذاں کے ساتھ ہمیں دفرخی نے
ہوئی ایسی خوشی اللہ اکبر — کہ خوش ہو کر کہا یہ خود خوشی نے
موذن مرحبا بروقت بولا — تری آواز مکے اور مدینے

آخری شعر پر پہنچے تھے کہ برابر کی مسجد سے آواز آئی "اللہ اکبر، اللہ اکبر! اللہ اکبر، اللہ اکبر!" اس کے ساتھ ہی سب کے منہ سے نکلا "تری آواز مکے اور مدینے"۔ اذاں ختم ہوئی تو سب نے دعا کو ہاتھ اٹھائے۔ دعا سے فارغ ہو کر مرزا فخرو نے کہا۔

"صاحبو! کچھ عجیب اتفاق ہے کہ فاتحہ خیر ہی سے یہ مشاعرہ شروع ہوا تھا اور اب فاتحہ خیر ہی پر ختم ہوتا ہے"۔

یہ کہ کر انہوں نے دونوں شمعوں کو جو جھک کر ان کے سامنے آئی تھیں بجھا دیا۔ شمعوں کے گل ہوتے ہی نقیبوں نے آواز دی کہ "حضرات مشاعرہ ختم ہوا"۔ یہ سننا تھا کہ چلنے کو سب کھڑے ہو گئے۔ سب سے پہلے مرزا فخرو سوار ہوئے اور پھر سب ایک ایک کر کے رخصت ہوئے۔

آخر میں میں اور نواب زین العابدین خاں ہو گئے۔ میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا۔ کہنے لگے "میاں کریم الدین یہ تمہاری نیک نیتی تھی جو اتنا بڑا مشاعرہ بخیرد خوبی ختم ہوا۔ تمہارا کام بھی بن گیا اور میرا ارمان بھی نکل گیا اچھا خدا حافظ۔"

(مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی)